جلد پنجم　　اپریل سنہ ۱۹۲۵ء　　حصۂ ہیجدہم

اُردو

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

ربندرا ناتھہ ٹیگور

کی شہرۂ آفاق تصنیف

گیتان جلی

از

(ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم)

(۱)

جب ربندرا ناتھہ ٹیگور کی کتاب " گیتان جلی " (نیاز نغمہ) شایع ھوئی میں انگلستان میں موجود تھا۔جس طرح شورش و انقلاب کے بعد سیاسیات کے عالم میں ھر شے زیر و زبر ھوجاتی ھے ٹیگور کی آمد اور فتوحات نے قلمروئے سخن کو درھم برھم کردیا تھا۔ڈبلو۔بی۔ییٹس W.B.Yeats آئرلنڈ کے افسرالشعرا ارنسٹ رھس Ernest Rhys ویلز کے ادیب متحرم اور خود ملک الشعراے انگلستان اُن کو موجودہ زمانہ کی شاعری کا تاج پیش کر رھے تھے۔ کپلنگ Kipling نے تاب نہ لاکر اِن تمام ھنگاموں سے دور خاموشی میں پناہ لے لی تھی۔ایک شب ایک بزم شعرا میں جانے کا اتفاق ھوا۔وھاں ایک نوجوان شاعر نے جن کی ذات سے آئندہ انگریزوں کو بڑی اُمیدیں ھیں کہا " جس دن سے ٹیگور کا کلام شایع ھوا ھے میں نے قلم ھاتھہ سے رکھہ دیا ھے اور اسی سوچ میں ھوں کہ آخر کیا کہوں "—

اِس کے بعد جب میں انگلستان سے الھانیہ واپس آیا وہ عین وہ زمانہ تھا کہ "نوبل انعام" کو عطا ھوئے دس بارہ روز گذرے تھے - ٹیگور کا نام زبان زد تھا اور ھر کہ ومہ کے لب پر یہی تذکرہ تھا - علمی اور شاعرانہ دنیا میں کیا کیا چرچے تھے - ھفتہ بھر کے اندر گیتان جلی ترجمہ ھوکر شایع ھوگئی تھی اور میہنہ کے ختم تک "باغبان" اور "ھلال" کے تراجم کے طبع ھوجانے کا اشتہار تھا - ایک روز میں ایک دکان میں جہاں میں اکثر کتابیں خریدا کرتا تھا داخل ھوا - دوکاندار نے اپنے خریداروں سے از راہ فخر کہا "یہ ٹیگور کے ھم وطن ھیں" ھر طرف سے مجھہ پر یورش ھونے لگی اور "آپ کو اور ھندوستان کو مبارک ھو" کی صدائیں بلند ھوئیں —

ایک خاتون (گیتان جلی کتابوں میں سے اٹھا کر) - "یہ تراجم درست بھی ھیں یا نہیں ؟"

ایک صاحب - "گیتان جلی کے لفظ کی ترکیب از روے قواعد کیا ھے؟"

ایک دوسری خاتون - (گیتان جلی میں دکھلا کر) - "کیا حضرت مصنف کی صورت بالکل ایسی ھی ھے ؟ ماشاالله کیا پاکیزہ "ھندوالھانی" خد و خال ھیں -"

میں نے بہ مشکل تمام ٹیگور کے ان غائبانہ مداحوں سے رھائی پائی —

چار پانچ روز میں سنا کہ شاہ سیکسنی کے حکم سے مجارستان (ھنگری) کی مشہور زمانہ مغنیہ نے گیتان جلی کے چیدہ مقامات حفظ کر شاھی سرود خانے میں سنا کر بے حساب داد حاصل کی -

ایک مہینہ کے اندر اندر علاوہ "باغبان" اور "ھلال" کے تراجم کے ربندرا ناتھہ کی سوانح عمری بھی شایع ھوگئی —

یہ دو مھالک کی چشم دید حالت ھے اور اقالیم میں بھی ایسی ھی قدر و منزلت ھوئی - اھل فرانس کو نہایت وثوق سے یقین تھا کہ "نوبل انعام"

اناطول فرانس Anatole France کو ملے گا- لیکن باوجود مایوس ہونے کے وہ قدردانی میں کسی سے کم نہیں رہے- یورپ کی کوئی زبان ہی شاید ایسی ہو جس میں ٹیگور کا مجموعۂ نظم ترجمہ نہ ہوگیا ہو- رومانی- سربی- مجاری (ہنگیرین) زبانوں تک میں ترجمہ کا مجھے ذاتی علم ہے—

(ب)

جب میں ہندوستان واپس آیا تو میرا خیال تھا کہ یہاں کی علمی دنیا میں بھی یہی حالت ہوئی ہوگی اور ٹیگور کے اعجاز قلم نے سب کو حیرت میں ڈال دیا ہوگا- لیکن یہاں عام طور پر تعلیم یافتہ جماعت کو ٹیگور کے نام تک سے ناآشنا اور خواص کو اُس کی خوبیوں کا منکر پایا- یہاں کے علمی طبقوں میں یہ حالت دیکھی کہ سخن فہموں کو داد تک دینے سے اغماض تھا- خود بنگال میں ندائے مخالفت بلند پائی- ع " چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی " ہندوستان کی منطق یہ ہے کہ ٹیگور اور اقبال ہمارے ملک کے لحاظ سے بڑے شاعر نہیں ہیں لیکن اُن کا یورپ کے شعرا سے مقابلہ کرنا اور اُن کو مغنیان فرنگ کا ہمپایہ خیال کرنا یا استغفراللہ اُن سے ارفع اور اعلیٰ قرار دینا نہ صرف سوے ادب بلکہ گناہ ہے- کہاں ہندوستان کی تیرہ خاک کہاں یورپ کی خانہ گاہ- یہ خاک اور وہ عالم پاک- یہاں کے ساکنوں کو وہاں کے مکینوں سے نسبت ہی کیا ہے- اگر یورپ خود ٹیگور کی تعریف میں رطب اللسان ہے تو یہ کسر نفسی بھی کوئی مغربی ادا ہے اور اس میں بھی کوئی راز ہے ورنہ ہند کی خاک سے کوئی فرزانہ کب اُٹھ سکتا ہے—

میں نے کہا کہ دعوے الفت- مگر غلط کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

ایک صاحب نے جو انگلستان کی ایک معروف کلیہ کے فرزند ہیں اور انگریزی زبان میں شاعری بھی کرتے ہیں فرمایا " ٹیگور کے خیالات عیسویت کے خیالات ہیں جو اُس نے برہمو سماج کے ذریعہ سے ورثہ میں پائے ہیں

اهل یورپ نے مصلحتاً ربندراناتھ کو مشہور کیا ہے۔ٹیگور کی شہرت سے
درحقیقت تبلیغ دین مسیحی مقصود ہے ''اس اعتراض کا بہترین جواب گیتان جلی
کے محض سرسری مطالعہ سے کافی اور شافی مل سکتا ہے۔جس بنگال کا ٹیگور
فرزند ہے وہ وہ بنگال ہے جو'' چیتنیادیو ''اور'' چندراسین'' کے مشہور ناموں سے
منسوب ہے۔جس شخص نے ٹیگور کے والد ماجد'' دیوندراناتھ ٹیگور''کی سوانح
عمری کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ ٹیگور کا مذہب اپنشدوں کی لافانی تعلیم کے
سوا کسی اور عقیدہ پر مبنی نہیں—

ایک اور نہایت ذی علم نوجوان نے جن کا مطالعہ نہایت ہی وسیع ہے
اور جو اکثر مغربی اور مشرقی ادب سے واقف ہیں فرمایا کہ میں ٹیگور میں
کوئی نئی بات نہیں دیکھتا۔یہ تمام خیالات قدیم ہندو اور جدید ہندی
شاعری میں موجود ہیں۔یہ اعتراض ایسا ہی ہے جس طرح کوئی شخص'' میردرد''
''خواجہ حافظ''اور''حکیم سنائی''کے کلاموں میں اس وجہ سے کہ تینوں تصوف کے
رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں امتیاز نہ کرسکے۔یہ بجا ہے کہ ٹیگور کی بہت سی
تشبیہات''کالیداس''سے مشابہ ہیں لیکن یہ محض اس وجہ سے ہے کہ دونوں خاص
ہندی استعارات سے کام لیتے ہیں۔یہ درست ہے کہ ٹیگور کے بہت سے خیالات
''کبیر'' سے ملتے ہیں لیکن اِس کا باعث صرف یہ ہے کہ دونوں کا کلام حمد و سپاس
الٰہی میں ہے۔انگلستان میں بھی چند اشخاص نے جن کی تعداد دو تین سے زیادہ
نہیں ٹیگور کے کمال کا انکار اِسی پیرایہ میں کیا ہے۔ایک صاحب ٹیگور کو ''شیلے''
Shelley کا خوشہ چین بتلاتے ہیں اور ایک اور'' فرانسیس تامپسن'' Francis
Thompson کا مقلد خیال کرتے ہیں—

(ج)

میں نے خود ایک زمانہ ہوا ''گیتان جلی'' کا ترجمہ کرنے کا قصد کیا تھا۔میرا
ارادہ تھا کہ ترجمہ نظم معرا (غیر مقفی) میں کروں تاکہ جہاں تک ہوسکے کلام کی

خوبی قائم رہے - لیکن چونکہ ٹیگور کے کلام کو ترجمہ میں ادا کرنے میں اس کی عظمت کے لحاظ سے ایسی ذمہ داری مجھہ پر عائد ہوتی تھی جس کا میں متحمل نہ ہوسکا یہ ارادہ پورا نہ ہوا - دس پندرہ مقامات ترجمہ کرکے رہ گیا - یہاں بطور نمونہ کے ایک مقام کا ترجمہ درج کرتا ہوں —

گیتان جلی مقام ۹۰

موت دستک دیگی جس دم تیرے دروازہ پہ آ
کیا تواضع اپنے مہماں کی بجا لائے گا تو ؟
مرحبا! سلطان من حاضر ہے مینائے حیات
نوش عیش اور نیش غم دونوں کا یہ آمیزہ ہے
عمر کا میری ہے حاصل بس یہی لبریز جام
نوش جاں حاضر جو ہے بہر کرم فرمائیے

جہاں مجھے ملک کی ناقدردانی کا افسوس رہتا تھا وہیں اپنی بے کمالی کا بھی رنج تھا لیکن وہ بربط جس پر ٹیگور کے ترانۂ توحید کی شورانگیز لے بلند ہو میری آغوش میں نہ سماتا تھا - میری ارضی طبیعت اُس کی سماوی علویت کی تاب نہ لاسکی - لیکن الحمدللہ جس کام کو میں نہ کرسکا اُس کو ایک قابل ادیب نے پورا کیا —

(د)

نسل شام کے اجداد نے عرب کے اُس دشت ناپیدا کنار کے آغوش میں تربیت پائی تھی جو ایک شیشۂ ساعت کی طرح تھا اور جس میں وقت مدام ریگ افشانی میں مشغول رہتا تھا - اِس صحرائے سموم میں ویرانی کے سوا کوئی آباد نہ تھا جب سموم رک جاتی تھی تو ہر جانب ایک پر رعب فضا پیہا خاموشی مسلط ہو جاتی تھی - کسی درندہ کی ہولناک چیخ تک سکوت کو نہ توڑتی تھی - یہاں

اهل یورپ نے مصلحتاً ربندرا ناتھ کو مشہور کیا ہے - ٹیگور کی شہرت سے درحقیقت تبلیغ دین مسیحی مقصود ہے" اس اعتراض کا بہترین جواب گیتان جلی کے محض سرسری مطالعہ سے کافی اور شافی مل سکتا ہے - جس بنگال کا ٹیگور فرزند ہے وہ وہ بنگال ہے جو "چیتنیا دیو" اور "چندرا سین" کے مشہور ناموں سے منسوب ہے - جس شخص نے ٹیگور کے والد ماجد "دیوندرا ناتھ ٹیگور" کی سوانح عمری کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ ٹیگور کا مذہب اپنشدوں کی لافانی تعلیم کے سوا کسی اور عقیدہ پر مبنی نہیں —

ایک اور نہایت ذی علم نوجوان نے جن کا مطالعہ نہایت ہی وسیع ہے اور جو اکثر مغربی اور مشرقی ادب سے واقف ہیں فرمایا کہ میں ٹیگور میں کوئی نئی بات نہیں دیکھتا - یہ تمام خیالات قدیم ہندو اور جدید ہندی شاعری میں موجود ہیں - یہ اعتراض ایسا ہی ہے جس طرح کوئی شخص "میر درد" "خواجہ حافظ" اور "حکیم سنائی" کے کلاموں میں اس وجہ سے کہ تینوں تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں امتیاز نہ کرسکے - یہ بجا ہے کہ ٹیگور کی بہت سی تشبیہات "کالیداس" سے مشابہ ہیں لیکن یہ محض اس وجہ سے ہے کہ دونوں خاص ہندی استعارات سے کام لیتے ہیں - یہ درست ہے کہ ٹیگور کے بہت سے خیالات "کبیر" سے ملتے ہیں لیکن اِس کا باعث صرف یہ ہے کہ دونوں کا کلام حمد و سپاس الٰہی میں ہے - انگلستان میں بھی چند اشخاص نے جن کی تعداد دو تین سے زیادہ نہیں ٹیگور کے کمال کا انکار اِسی پیرایہ میں کیا ہے - ایک صاحب ٹیگور کو "شیلے" Shelley کا خوشہ چیں بتلاتے ہیں اور ایک اور "فرانسیس تامپ سن" Francis Thompson کا مقلد خیال کرتے ہیں —

(ج)

میں نے خود ایک زمانہ ہوا "گیتان جلی" کا ترجمہ کرنے کا قصد کیا تھا - میرا ارادہ تھا کہ ترجمہ نظم معرا (غیر مقفی) میں کروں تاکہ جہاں تک ہوسکے کلام کی

خوبی قائم رهے - لیکن چونکہ ٹیگور کے کلام کو ترجمہ میں ادا کرنے میں اس کی عظمت کے لحاظ سے ایسی ذمہ داری مجھہ پر عائد ہوتی تھی جس کا میں متحمل نہ ہوسکا یہ ارادہ پورا نہ ہوا - دس پندرہ مقامات ترجمہ کرکے رہ گیا - یہاں بطور نمونہ کے ایک مقام کا ترجمہ درج کرتا ہوں —

گیتان جلی مقام ۹۰

موت دستک دیگی جس دم تیرے دروازہ پہ آ
کیا تواضع اپنے مہماں کی بجا لائے گا تو ؟
مرحبا ! سلطان من حاضر ہے مینائے حیات
نوش عیش اور نیش غم دونوں کا یہ آمیزہ ہے
عمر کا میری ہے حاصل بس یہی لبریز جام
نوش جاں حاضر جو ہے بہر کرم فرمائیے

جہاں مجھے ملک کی ناقدردانی کا افسوس رہتا تھا وہیں اپنی بے کمالی کا بھی رنج تھا لیکن وہ بربط جس پر ٹیگور کے ترانۂ توحید کی شورانگیز لے بلند ہو میری آغوش میں نہ سماتا تھا - میری ارضی طبیعت اُس کی سماوی علویت کی تاب نہ لاسکی - لیکن الحمدللہ جس کام کو میں نہ کرسکا اُس کو ایک قابل ادیب نے پورا کیا —

(د)

نسل شام کے اجداد نے عرب کے اُس دشت ناپیدا کنار کے آغوش میں تربیت پائی تھی جو ایک شیشۂ ساعت کی طرح تھا اور جس میں وقت مدام ریگ افشانی میں مشغول رہتا تھا - اِس صحرائے سموم میں ویرانی کے سوا کوئی آباد نہ تھا جب سموم رک جاتی تھی تو ہر جانب ایک پر رعب فضا پیہا خاموشی مسلط ہو جاتی تھی - کسی درندہ کی ہولناک چیخ تک سکوت کو نہ توڑتی تھی - یہاں

قدرت محض آفتاب-ماهتاب-ستاروں اور ریت کا مجموعہ تھی-سورج کی تاب و تابش میں بھی ایک جلوۂ قہر تھا-ریت کی طپش جان اور آرام کی دشمن تھی چاند ستارے خوبصورت ضرور تھے مگر بے فائدہ اس لئے گو نسل شام نے کواکب پرستی کی بنیاد ڈالی لیکن اُن کے دل نے اپنے عقیدے پر خود گواہی نہ دی حضرت ابراهیم نے جو تقریر شمس و قمر کے طلوع و غروب اور ستاروں کو دیکھہ کر کی وہ تمام نسل شام کی فریاد تھی جو دلوں سے زبان تک آگئی تھی گویا توحید یعنی یکتائی کا خیال قدرت نے اُن کے دلوں میں خود ودیعت کر رکھا تھا-آفتاب کا ثانی کوئی نہ تھا ماهتاب اپنی مثال نہ رکھتا تھا ازل اور ابد کے تصورات بھی تمثیلاً دل میں موجود تھے کہیں سے کہیں نکل جانے پر بھی میناے لاجورد اور سراب دشت رفاقت نہ چھوڑتے تھے نہ صورت بدلتے تھے اس لئے جب اُن کو ایک ایسی هستی سے آگاہ کیا گیا جو علائق دنیا اور قیود عالم سے آزاد هے سب سے بالا موجودات سے ارفع-ازلی-ابدی-اور یکتا هے اور جو مہر و ماہ-ریگ و دشت-عرش و فرش سے لا تعلق هے جس کا علم قیاس و گمان بلکہ وهم سے برتر هے تو اُنہوں نے بدل تسلیم کرلیا یہی مطلوب تھا جس کی اُن کو تلاش تھی —

آریا نسل کے اسلاف نے جو ایران اور وسط ایشیا سے هندوستان کی جانب آئے اُن عظیم‌الشان بیابانوں کو جن کو قدرت نے شیر و اژدر کی نشیمن گاہ بنایا تھا اپنی فرود گاہ مقرر کیا-دامن همالیہ اور بندرابن کے قدرتی سرسبز سائبان معبد اور مندر قرار دئے گئے-جدھر نظر اُٹھتی تھی آب رواں اور سبزہ زار پیش نگاہ تھا-هر پیکر محسوس میں خدائی کار فرما نظر آتی تھی اور هر میدان و جبل دریا اور رود آب سے انا الحق کی صدا بلند هوتی تھی گونا گوں اثمار شیریں من و سلویٰ کا کام دیتے تھے اور برفاب سے لبریز چشمے پیاس بجھاتے تھے-قدرت خود قاضی الحاجات تھی-طیور کی زمزمہ سنجی بزم

سماع اور شاهدان گُل کی حسن آرائی محفل وجد تھی۔کثرت میں ذات باری پنہا بلکہ آشکارا نظر آتی تھی ۔

جب عربوں کا فارس پر اور مسلمانوں کا ھند پر تسلط ھوا تو اِن دونوں مذھبی خیالات کا بھی ایک دوسرے پر تصرت ھوا۔اِس سے ایران میں تصوت نے فروغ پایا لیکن فطرتاً تصوت آریا نسل کے عجمی مسلمانوں کی طبائع سے زیادہ رابط تھا۔عربی الخیال مسلمانوں نے عموماً اپنی قدیم اسلامی روایات کو قائم رکھا۔شاعری ایک وسیع حد تک مذھب کی تابع ھے اس لئے ایک جانب تو صوفی شعرا۔ع "خود کوزہ خود کوزہ گر خود گل کوزہ" خود رند و سبوکش کی تفسیر بیان کرنے لگے دوسری جانب اسلامی شعرا اِن الفاظ کو ورد کرتے رھے

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وھم
وز ھرچہ خواندہ ایم و شنیدیم وگفتہ ایم

اُردو شاعری میں بھی جو فارسی کا تتبع ھے یہی دوئی کی کیفیت موجود ھے ایک فریق فارسی "ھمہ اوست" اور ایک عربی "ھمہ اوست" کا قائل ھے اس کے مقابل میں ھندو شاعری کی بنیاد ابتدا ھی سے "وحدت الوجود" پر مبنی ھے۔ٹیگور کی شاعری ھندی شاعری ھے ۔

(۵)

فیضی کا سر دیوان یہ شعر ھے ۔

یا ازلی الظہور یا ابدی الخفا
نورک فوق النظر حسنک فوق الثنا

خواجہ میر درد اپنا کلام یوں شروع کرتے ھیں ۔

مقدور ھمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا
حقا کہ خداوند ھے تو لوح و قلم کا

جس مسند عزت پہ کہ تو جلوہ نما ھے

کیا تاب گذر ھووے تعقل کے قدم کا

لیکن ٹیگور فرماتے ھیں میں ایک جام سفال ھوں جس کو وہ رند حقیقی رنگا رنگ مے سے معمور کرتا ھے توڑ دیتا ھے اور پھر اعجاز کوزہ گری سے وجود میں لا کر الوان شراب سے لبریز کر دیتا ھے۔ نہ میرا کوتاہ پیمانہ بھرتا ھے نہ وہ میکش سیر ھوتا ھے۔ یہ ھماری ازلی اور ابدی لب بوسی ھے —

خوشی تیری اِسی میں ھے بنا اک جام گل مجھہ کو

بھرے خالی کرے ھردم زلال زندگانی سے

یا کہتے ھیں دنیا ایک صنم کدہ ھے میرا صورت گر خود میرا عاشق ھے

اس کا ذی حیات مس میرے تمام اعضا پر محیط ھے

یا کہتے ھیں میں وہ منتظر عورت ھوں جو اپنے شیام سندر کے انتظار میں سونی سیج پر طوفانی راتوں میں اُس کی آمد کی گھڑیاں گنتی رھتی ھے

وہ کسی جنگل کے کنار بعید کسی تاریکی کے پر پیچ عمق سے آنے والا ھے

آہ وہ بھی کیا ستم ظریف ھے ھمیشہ اس وقت آتا ھے جب میں تھک کر سو جاتی ھوں اور

اپنے بربط کے نغموں سے میری نیند کو بھر دیتا ھے اور میں اُس کا دیدار چوک جاتی ھوں جس کی سانس میری نیند کو چھو چھو جاتی ھے

جب صبح کو عورتوں کے ساتھہ پانی بھرنے جاتی ھوں تو کنویں پر جہاں " بابلا " اور نیم کے درخت ھیں وہ آتا ھے اور ھتیلیاں جوڑ کر مجھہ سے پانی مانگتا ھے۔ اُس کی طلب میں کیا شیرینی ھے یہ حلاوت عمر بھر میرے دل سے نہ جائے گی —

جب میں کاسۂ گدائی لے کر نکلتی ھوں تو وہ بادشاھوں کا بادشاہ

بن کر زریں رتھہ میں سوار ایک عجب آن بان سے سامنے سے آکر میرا راستہ روک لیتا ھے اور مجھے دیکھہ کر مسکراتا ھوا نیچے اُتر آتا ھے میں خیال کرتی ھوں کہ میری حیات کا لمحۂ خوش کامی آگیا اور امید کرتی ھوں کہ اب دولت چاروں طرف بکھر جائے گی لیکن ناگہاں وہ خود اپنا ھاتھہ میرے سامنے بھیک کے لئے پھیلا دیتا ھے —

یا کہتے ھیں عالم ایک محفل سماع ھے - فرش زمیں سے عرش بریں تک عالم امکان ترانۂ معرفت سے لبریز ھے --

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائیہا شکایت می کند

اور وہ "نے" میں خود ھی ھوں —

پھرا اِس نے کو تو لے کر ھر اک کہسار و وادی میں
اِسی میں کی ھے دم تونے ھمیشہ تازہ موسیقی

یا کہتے ھیں کہ نہیں میں تو مغنی ھوں جس کی ملازمت حضور الٰہی میں نغمہ سنجی ھے —

جب تو دیتا حکم ھے مجھہ کو کہ ھوں نغمہ سرا
فخر سے دل میرا سینہ میں سما سکتا نہیں

جب سب مغنی اپنا راگ ختم کر چکتے ھیں تو بربط نواز عالم خود بربط اٹھا لیتا ھے - اُس وقت کی کیفیت بیان سے باھر ھے —

سرود تیرا کرے ھے روشن تمام عالم کو اے مغنی
ھے روح نغمہ رواں فلک پر مثال تار حیات دایم
رواں ھے گو سنگ ھوں مزاحم ترے ترانہ کا پاک دریا
ھے کیسی دل میں مرے تمنا شریک تیرے سرود میں ھوں
صوت سرمدی کو سن کر طائر روح عرش آشیاں ھونا چاھتا ھے —

اے طائراں قدس را افزودہ عشقت بالہا

درحلقۂ سودائے تو روحانیاں را حالہا

چنانچہ کہتے ہیں—

طائر بازو کشادہ سینۂ دریا پہ جوب

میں بھی خوش خوش ہوں رواں پیش نظر ہے آشیاں

کر وسیع شہبال نغمہ عرش تک آیا ہوں میں

تیرا پابوس مقدس تو کہاں اور میں کہاں

وہ نغمہ جو اس محفل میں بجتا ہے سرود حقیقت ہے۔اِس سلطان الاذکار میں کوئی صدا یا ندا نہیں

مرے نغمہ کی آرائش نہیں جز عین عریانی

لباس اور ظاہری زینت سے تن اُس کا مبرا ہے

نہیں شبنم صفت اک پیرہن تک وصْل میں حائل

نہ زیور جو تری سرگوشیوں میں غل سے حارج ہو

گویا بقول نظیر اکبرآبادی—

دل اُن کے تار ستاروں کے تن اُن کے طبل طبانچے ہیں

منہ چنگ زباں دل سارنگی یا گھنگرو ہاتھہ کہانچے ہیں

بن تاروں تار ملاتے ہیں تب نرت نرالا کرتے ہیں

بن ہاتھوں بھاؤ بتاتے ہیں بن پاؤں کھڑے گت بھرتے ہیں

جس گت پر اُن کا پاؤں پڑا اُس گت کی چال نرالی ہے

جس محفل میں وہ ناچے ہیں وہ محفل سب سے خالی ہے

ہیں راگ اُنہیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ اُنہیں کے سانچے ہیں

جو بے گت بے سر تال ہوئے بن تال پکھاوج ناچے ہیں

یا کہتے ہیں کہ عالم ایک باغ ہے جس میں میری ہستی ایک آرزومند پھول

سے مشابہ ہے—

اِس ذرا سے پھول کو بہر قبول
شاخ سے چن لینے میں مت دیر کر
ورنہ مجھ کو خوف ہے اے گلعذار
خشک ہو یہ خاک میں مل جائے گا
گو پریدہ رنگ ہے اور بو نحیف
رحم کر اور توڑ لے قبل از غروب
وقت ہے باقی عبادت کا ہنوز
بتکدہ میں کردے دیوں پر نثار

(و)

ٹیگور کا علم الاخلاق اپنشدوں کی تعلیم پر مبنی ہے۔اپنشدوں کی تعلیم روحانیت کی تائید اور مادیت کے بطلان میں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ روحانیت کیا ہے اور مادیت کیا ہے ؟

گیتان جلی کے مترجم نے اپنے دیباچہ میں نئی روشنی کے جدید تعلیم یافتہ اصحاب کو ترک روحانیت پر بجا ملامت کی ہے اور اُن کی مغربیت کو جو ایک انجذاب گدایانہ اور تقلید غلامانہ ہے قابل نفریں جنون اور دیوانگی سے تعبیر کیا ہے۔لیکن اُن کی تحریر واضح اور عیاں نہیں ہے اور اُن کے مافی الضمیر سے کافی اطلاع نہیں دیتی—

اپنشدوں کے روحانی فلسفہ کے متعلق اکثر ہندو مفسرین اس مغالطہ میں پڑ گئے ہیں کہ وہ دنیا کو محض مایا تصور کرتے ہیں اور صرف ترک دنیا کو "نروان" حاصل کرنے کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔اِس مغالطہ سے رہبانیت کا خیال ہندؤں کے اعتقاد میں راسخ ہوگیا ہے اور حیات ملکی اور ملی بجائے

جہد للبقا میں صرف ہونے کے منتشر اور ضائع ہورہی ہے۔ مسلمان بھی لفظ "روحانیت" کو غلط قناعت اور بے محل استغنا کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

ٹیگور کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں۔

ٹیگور کا مذہب "جبریہ" نہیں بلکہ "قدریہ" ہے وہ اپنی کتاب الاخلاق "سادھنا" میں کہتے ہیں۔

ماسوا کا اک جز ہونے کی حیثیت سے انسان نوامیس الہیہ اور قوانین قدرت کا ضرور مطیع ہے لیکن بالذات "انا" قطعاً آزاد ہے۔

سری کرشن مہاراج نے جو یہ فرمایا ہے کہ میں افعال سے بالا ہوں اِس کا یہ مطلب نہیں کہ کامل بشر بے کار اور بے شغل زندگی بسر کرتا ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ جہاد زندگی اور تنازع الحیات میں کامیابی اور ناکامی کے خیال سے آزاد ہوکر بے لوث کوشش کرنی چاہئے۔ ٹیگور "سادھنا" میں بیان کرتے ہیں۔

زندگی کی خوشی کام میں ہے۔ کام میں ایک عجب لذت ہے۔ یہ لذت تکمیل حیات میں ممد اور معاون ہے۔ کوئی ذی حیات اس قدر محنت اور مشقت نہیں کرتا جس قدر انسان۔ اور یہی انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی دلیل ہے۔ زندگی تغیرات باطنہ کو تغیرات خارجہ سے مماثل اور مناسب کرنے پر منحصر ہے۔ ہمارے ملک میں لوگ حصول طاقت اور حصول وسعت کے روحانی اصولوں کو بھول گئے ہیں۔ لوگ "برھما" سے صرف مراقبہ سے معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور عالم کے کون و فساد میں جہاں اُس کی ذات ذرہ ذرہ میں مصروف جہد ہے اس کو دیکھنے سے

گریز کرتے ہیں اِس یک طرفہ کیفیت سے ہندوستان کے مزاج میں
ایک مجذوبیت پیدا ہوگئی ہے جس نے ہمیں دین اور دنیا دونوں
سے کھو دیا ہے —

اگر کوئی شخص "گیتان جلی" کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ٹیگور
کی تعلیم اعتکاف نشینی اور چلہ کشی ہے تو اِس سے زیادہ کوئی اور غلطی ممکن
نہیں - صومعہ نشینی گناہ ہے کیوں کہ معرفت الٰہی کام میں ہے آرام میں نہیں -
جو زن و فرزند - فرائض زندگی اور علائق دنیا سے بھاگتا ہے وہ خود خدا سے
بھاگتا ہے - چنانچہ "گیتان جلی" میں کہتے ہیں —

یہ عبادت نغمہ و سرود یہ تسبیح خوانی چھوڑ - دروازہ بند کرکے
خانقاہ کے سنسان اور تاریک گوشے میں تو کس کی پرستش
کر رہا ہے ؟

آنکھیں کھول - دیکھ تیرا خدا تیرے روبرو نہیں —
وہ تو وہاں ہے جہاں کاشتکار سخت زمین میں ہل چلا رہا ہے - جہاں
سڑک بنانے والا پتھر توڑ رہا ہے - وہ تو اُن کے ساتھ دھوپ
اور بارش میں ہے - اُس کا ملبوس خاک سے اَٹا ہوا ہے - یہ خرقۂ
سالوس اُتار کے پھینکدے اور اُسی کی طرح خاک زمین پر اُتر آ -

زاہدانہ یا فلسفیانہ گوشہ نشینی ایک ابدی قبر ہے آزاد وہ ہیں جو
بنی نوع کو ظالمانہ قیود سے آزاد کرتے ہیں جو حریت کے علم بردار ہیں جن
کا لقب فاتح ہے جن کو خدا نے اپنی تیغ جوہردار عطا کی ہے —

میرا خیال تھا کہ میں تجھ سے وہ گلاب کا ہار مانگوں گی
جو تیری گردن میں ہے لیکن ہمت نہ ہوئی - بالاخر صبح کی
منتظر رہی کہ جب تو جانے لگے گا تو بستر پر جو چند اجزا اس
کے رہ جائیں گے لے لوں گی - ایک بھکاری لڑکی کی طرح میں نے

صبح کو تلاش کی کہ ایک یا دو ھی باقی ماندہ پریشان پنکھڑیاں مل جائیں ؟ لیکن مجھے کیا ملا ؟ تیری محبت کی کونسی نشانی میں نے پائی ؟

نہ وہ پھول ھے نہ کوئی خشبودار مسالہ نہ کوئی عطر کا ظرف۔ وہ تیری زبردست تلوار ھے شعلہ کی طرح چمکدار اور گرج کی طرح وزنی وہ تیری خوفناک تلوار ھے—

جن کے لئے زندگی ایک روز مشقت ھے اُن کے لئے موت ایک پر راحت شب آرام ھے۔موت شبستان وصل کا دروازہ ھے—

پھول گوندہ لئے گئے ھیں ھار دولھا کے لئے طیار ھے۔شادی کے بعد دلہن اپنا گھر چھوڑ دیگی اور اپنے مالک سے تنہا رات کے سناٹے میں ملے گی—

فرانسیسی مجلس علمی کی تاریخ

مترجمه

(جناب مولوی سید وهاج الدین صاحب پروفیسر اورنگ آباد کالج)

فرانس کی مجلس علمی صرف اسی حیثیت سے دلچسپ نہیں ہے کہ اُس کا بانی ایک مشہور شخص تھا - یا یہ کہ مختلف مشاہیر نے اپنی دماغی کاوشوں سے اس میں چار چاند لگا دئے ہیں - اس کی دلچسپی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ صرف یہی مجلس اپنی نوعیت میں قدیم زمانہ سے اب تک بجنسہ چلی آرہی ہے - پچھلے چند ہفتوں سے انگریزی اخبارات اور رسالوں میں یہ بحث چل رہی ہے کہ انگریزی ادیبوں کی بھی ایک مجلس قائم کی جائے - اس میں شک نہیں کہ یہ بحث اپنی ابتدا کے لحاظ سے فضول اور اپنے نتائج کے اعتبار سے بے اثر ضرور ہے لیکن چونکہ بعض ہنگامہ آرا ادیب اسی مجلس کی ہیئت اور انتظام کو بطور نمونہ پیش کرتے رہتے ہیں - اس لئے شاید ان چیزوں پر نظر ڈالنا خالی از نفع نہ ہوگا —

اب سے ڈھائی صدی پیشتر جب یہ مجلس قائم ہوئی تھی فرانس میں نوابی اور جاگیرداری کا دور دورہ تھا - پرانی نسل برسر حکومت تھی اور پرانے ہی قانون نافذ تھے - اس کے ڈیڑھ سو سال بعد انقلاب عظیم کی آندھی کچھ ایسی اُٹھی کہ اس نے ملک کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک نہ صرف قدیم شاہی نسل اور اشرافیت کو جڑ بنیاد سے اُکھاڑ پھینکا - بلکہ

اُن تصورات اور طرز خیالات کا بھی خاتمہ کر دیا جو اس وقت تک رائج چلے آتے تھے-اس میں شک نہیں کہ تباہی و بربادی کی اس خاک سے ایک نئے فرانس نے جنم لیا-لیکن پرانی انجمنیں ہمیشہ کے لئے سونی ہو چکی تھیں اور جو رہ گئی تھیں وہ زمانے کے اقتضاء سے اپنا روپ بدل چکی تھیں—

اگرچہ (جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا) تھوڑی دیر کے لئے فرانسیسی مجلس علمی کو بھی طوفان کے تھپیڑوں کے آگے سر جھکانا پڑا-لیکن اُسے کچھ زیادہ صدمہ نہ پہونچا اس کی اندرونی قوت ویسی ہی باقی رہی جیسی کہ قیام کے وقت تھی اور آج تک ہے-وہی تنظیم ہے-وہی قواعد و ضوابط-اراکین کی وہی تعداد جس میں آج تک کبھی اضافہ نہ ہوا-یعنی "ابدی چالیس"—

یوں تو شروع ہی سے اس انجمن پر متعدد حملے ہوئے اور اسکے دشمن کثیر تعداد میں اور پرجوش رہے ہیں-لیکن اتنے بےشمار خطرات کا مقابلہ اسے کبھی نہیں کرنا پڑا جتنا کہ آج کل ہے-حقیقت یہ ہے کہ جوں جوں موجودہ صدی * کا خاتمہ نزدیک آتا جاتا ہے ویسے ہی جمہوریت کی روح قوی تر ہوتی جاتی ہے اور "تعمیر" کی بجاے "تخریب" کا رنگ زیادہ گہرا جھلکتا نظر آتا ہے-یہ خصوصیت فرانس میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے جہاں پرانی چیزوں کو سرے سے اُکھاڑ پھینکنے کا شوق ناقابل یقین شدت اختیار کئے ہوئے ہے-فرانسیسی مجلس علمی اس سیلاب سے کس طرح محفوظ رہ سکتی تھی-اسپر بھی ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں-اکثر ادیب جنھیں قدرتاً اسکے حامیوں میں ہونا چاہئے تھا-مخالفین کے جتھے میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں اور تعصب اور جنبہ داری کا الزام لگا کر اسے برا بھلا کہتے ہیں-دوسرے گروہ کو ان مخالفانہ حملوں کا سبب پہلے گروہ کی محرومی نظر آتی ہے اور یہ کہ ان لوگوں کو

---

* یہ مضمون انگلستان کے مشہور رسالہ "Black Wood's Edinburgh Magazine" میں سنہ ۱۸۹۱ ع میں لکھا گیا تھا—

مجلس کے اعزازات کے قابل خیال نہیں کیا گیا۔اب سوال یہ ھے کہ کیا یہ مجلس اپنی زندگی کے دن پورے کر چکی ھے؟ یا بقول میکالے نوح علیہ السلام کی کشتی کی طرح یہ بھی گرداب حوادث سے اُبھر آئے گی اور جس طرح کہ گذشتہ صدی کے سیاسی تغیرات سے متاثر نہ ھوئی ھے آئندہ بھی کامیاب رھے گی اور پہلے کی طرح فرانسیسی ادب کی تاریخ میں صف اول میں اپنی جگہ قائم رکھے گی؟—

انجام جو کچھہ بھی ھو اس مجلس کی موجودہ حیثیت بغایت دلچسپ ھے اگر ایک طرف اس کی سند کو مشتبہ سمجھا جاتا ھے اور اس کے دعووں کا مضحکہ اُڑتا ھے تو دوسری طرف اس کے اعزازات کے حصول کی جتنی کوشش آج ھوتی ھے پہلے کبھی نہ ھوئی ھو گی اور اس کی خالی جگہ پر کرنے اور اس کی عمارت کے مشہور "گنبد" کے نیچے جگہ حاصل کرنے کے لئے جتنے حریف آج میدان میں اُترتے ھیں اتنے پہلے کبھی نہ ھوں گے—

———:o:———

اگرچہ اس مجلس کا قیام فرمان شاھی کی رو سے سنہ ۱۶۳۵ع میں ھوا لیکن دراصل اس کے قیام کی مدت اس سے پانچ چھہ سال قبل کی ھے اور اس میں "حسن اتفاق" اور ارادہ دونوں کا یکساں دخل ھے اس مشہور و معروف مجلس کی ابتدا بہت معمولی تھی۔سب سے پہلے ھمیں اس انجمن کی اصلی روح "مالہرب" (Malherbe) کے چھوٹے سے کمرے میں اُبھرتی ھوئی نظر آتی ھے جس کی کل کائنات چند پھوس کی کرسیاں تھیں! اس مختصر کمرے میں شہر "پیرس" کے علمی افراد جمع ھوا کرتے تھے اور عام دلچسپی کے موضوعوں پر بحثیں رھا کرتی تھیں۔ناظم حلقہ کی رائیں (جو خود بھی شاعر اور نقاد تھا) سنی جاتی تھیں اور اس مختصر جماعت کا کوئی شخص اگر کوئی تصنیف پیش کرتا تھا تو اس پر تنقیدیں ھوتی تھیں۔خیالات ھی کو نہیں بلکہ زبان اور اسلوب بیان کو بھی سختی کے ساتھہ جانچا جاتا تھا۔یہ امر اس بات کا ثبوت ھے

کہ شروع ہی سے فرانسیسی ادیبوں نے حسن صورت کو اپنا مطمح نظر بنایا اور آج تک ان کے ادب میں خیالات کی اتنی پروا نہیں کی جاتی جتنی کہ ان کے لفظی ملبوسات کی —

سنہ ۱۶۲۹ع میں جب "مالہرب" کا انتقال ہوا تو اس مختصر جماعت کے لئے جس کے افراد شہر کے دور دراز اور مختلف مقامات پر رہتے تھے آپس میں ملنا جلنا دشوار ہو گیا۔ بالاخر یہ طے پایا کہ سب لوگ ہفتہ میں ایک مرتبہ "ایم۔کونرارت" (M. Conrart) کے مکان پر جمع ہوا کریں اس لئے کہ اس کا محل وقوع کسی قدر مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور "ادبی مباحث پر بحث کیا کریں اور سب سے زیادہ کوشش اس امر کی کریں کہ فرانسیسی زبان کی پاکی اور صحت میں ترقی ہو"—

بتدا میں یہ مختصر جماعت صرف نو افراد پر مشتمل تھی "کونرارت" کے علاوہ "ایم۔شاپلین" (Chapelain) بھی تھا جس کی سند ہر جگہ قابل قبول تھی جو تمام یورپ کے علمی افراد سے خط و کتابت رکھتا تھا اور اندرون و بیرون فرانس اس کی رائے کو ملہمانہ وقعت دی جاتی تھی۔ دوسرے اراکین یہ تھے۔ گودو (Godeu)۔ دی مالویل (De Maleville)۔ ہیبرت برادران جن میں کا چھوٹا بھائی ایبے دی کے ری سی (Abbe de Cerisy) کے نام سے مشہور ہے۔ ایم ژیری (Giry) ایم دی سیری زے وغیرہ۔ یہی وہ مرکز تھا جس سے فرانسیسی مجلس علمی کا آغاز ہوا۔ چند سالوں تک یہ لوگ اپنے جلسے کس مپرسی کی حالت میں کرتے رہے لیکن سنہ ۱۶۳۴ع میں ایم بواس رابرت کے ذریعہ سے لوئیس سیزدہم کے ذی اقتدار وزیر کارڈینل ری شی لیو (Richielieu) کو بھی ان جلسوں کی اطلاع ہوئی۔ بواس رابرت اس مجلس کے ایک رکن سے فارڈ کا دوست تھا۔ کارڈینل ری شی لیو کا مقرب خاص بھی تھا اور پیرس کے حالات سے اسے مطلع کرتا رہتا تھا—

وہ کونسا جذبہ تھا جس نے ری شی لیو جیسے شخص کو اس گمنام جماعت کا حامی اور سرپرست بنا دیا؟ کیا یہ بھی ہر بات میں پیش پیش رہنے کی اُمنگ کا ایک کرشمہ تھا؟ یا ادبی شہرت کی خواہش اس کا سبب تھی؟ کیونکہ اتنا ہم جانتے ہیں کہ ری شی لیو کا جو وقت سیاسی داؤں گھات اور قتل کے حکمناموں پر دستخط کرنے سے بچتا تھا وہ شعر گوئی میں صرف ہوتا تھا! یا پھر کیا کارڈینل نے بھی دوسرے طباع لوگوں کی طرح اپنی الہامی قوت سے اس بات کا اندازہ کر لیا تھا کہ آج کی یہ حقیر جماعت مستقبل کی بڑی علمی انجمن ہوگی اور خود اُس کا نام اس کے ساتھ منسلک ہو کر بقائے دوام کا مستحق ہو جائے گا!!

بہر حال جو کچھ بھی اصلی سبب ہو کارڈینل نے بواس رابرٹ کے ذریعہ اپنی سرپرستی کا پیغام پہنچوایا۔یہ دریافت کیا کہ کیا تم لوگ اپنی اس جماعت کو فرمان شاہی کے ذریعہ سے تسلیم کرانا چاہتے ہو اور بادشاہ سے اس فرمان کے حاصل کرنے کا وعدہ کیا—

اس پیغام کا سب سے پہلا اثر اراکین پر یہ ہوا کہ اُن میں انتہائی سراسیمگی پیدا ہو گئی۔خوفناک کارڈینل اور ایک علمی انجمن کے معاملات میں دخل دے! تب تو آج سے آزادی اور باہمی خلوص کو خیرباد کہدینا چاہئے!! اِن خیالات سے پریشان ہو کر انجمن نے اس اعانت کو قبول کرنے سے انکار ہی کر دیا ہوتا لیکن شاپلین نے جس کا حصہ انجمن کے معاملات میں اس وقت سے بہت ممتاز نظر آتا ہے۔تقریر کی۔اُس نے اِس ناعاقبت اندیشی کے انکار کی سختی سے مخالفت کی اور ایسے زبردست شخص کی دشمنی کے نقصانات بتائے۔ اُس نے کہا "کارڈینل نے ایک تجویز پیش کی ہے۔اُس کی سرپرستی ہماری معاون ہو سکتی ہے۔اُس کی مخالفت ہمیں بلا شبہ غارت کر دے گی ....ہم کو منظور ہی کرنا چاہئے" دوسرے افراد نے اس رائے کے آگے سر تسلیم خم کیا

اور بالاتفاق راے یہ طے پایا کہ انجمن کی طرف سے کارڈینل کو ایک خط لکھا جائے اور اس سے عنایت اور سرپرستی کی درخواست کی جائے۔ایم سی ری زے نے یہ خط مارچ سنہ ۱۶۳۴ع میں لکھا۔وہ اُس وقت انجمن کا ناظم تھا اور بواس رابرٹ سے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا—

کارڈینل نے اس خط کا نہایت عطوفت آمیز جواب بھیجا۔اُس نے وعدہ کیا کہ منشور شاہی بہت جلد حاصل کیا جائیگا اور اس نے انجمن کو نصیحت کی کہ اس مدت میں اراکین کی تعداد میں حسب صواب دید اضافہ کر لینا چاہئے۔اپنے طور پر ایک دستورالعمل مرتب کرنا چاہئے اور کسی نام کا انتخاب بھی کر رکھنا چاہئے۔چنانچہ کئی نئے اراکین داخل کئے گئے اور قدرتی طور پر ڈی بواس رابرٹ کا نام پہلے منتخب کیا گیا۔نام کا انتخاب بھی ایک اہم کام تھا۔ بڑے بڑے زبردست نام پیش کئے گئے۔لیکن انجمن نے حسن انتخاب سے کام لیکر سب کو رد کردیا اور ”مجلس علمی فرانس“ سیدھا سا نام منظور کیا گیا اور اسی نام سے یہ مجلس ہمیشہ مشہور رہی ہے۔اراکین مستعدی کے ساتھ دستورالعمل کی ترتیب میں مشغول ہوگئے۔اس کام کے لئے تین افراد کا انتخاب خاص طور پر کیا گیا۔لیکن دوسرے افراد کو بھی عام دعوت تھی کہ اپنے خیالات اور تجاویز تحریری صورت میں پیش کریں۔آخر میں ان سب کو ترتیب دیکر پچاس ضوابط کا ایک دستورالعمل تیار کیا گیا۔اکثر دفعات معمولی تھیں۔لیکن بعض نہایت اہم بھی تھیں۔مثلاً تمام اراکین مجلس کی کامل مساوات۔اگر اس وقت کا لحاظ کیا جائے جب کہ طبقہ بندی کا بہت زور شور تھا تو یہ دفعہ ایک بڑی رعایت نظر آتی ہے۔ مجلس کی مقدس حدود کے اندر سب برابر تھے۔گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا مصنف۔بڑے بڑے اسقفون۔ذی اقتدار وزرا۔سربرآوردہ ڈیوک اور خود شاہزادوں کے برابر کا مرتبہ رکھتا تھا۔مشہور و معروف کانڈے (Conde) کی ممبری اور خود ہمارے زمانے میں ڈیوک آمیں کی شرکت اس مساوات کا بین

ثبوت ہے- بیان کیا جاتا ہے کہ جب لوئی چہاردہم کا مشہور وزیر کولبرٹ (Colbert) مجلس کا رکن ہوا تو اکثر رفقاے مجلس نے اُسے ''مان‌سی‌نی‌یار'' (Monsignior) ''حضور'' کہہ کے مخاطب کیا لیکن کولبرٹ نے جواب دیا کہ ''اس حلقے میں دوسروں کی طرح میں بھی صرف ''صاحب'' موسیو (Monsieur) ہوں!''

———:o:———

انتظام کی بہتری کے خیال سے یہ بھی طے پایا کہ مجلس خود اپنے حلقے میں سے تین عہدہ دار منتخب کرے-ایک ناظم-ایک چانسلر اور ایک معتمد-اول الذکر دو عہدہ داروں کا انتخاب بذریعہ قرعہ ہوتا تھا اور ان کی مدت عہدہ تین ماہ تھی-معتمد کا منصب اس کی حین حیات تک رہتا تھا اور اس کا انتخاب رایوں کے ذریعہ سے ہوتا تھا یہی تینوں عہدے آج تک باقی ہیں لیکن اب ناظم اور چانسلر کا انتخاب بھی رایوں کے ذریعہ سے ہوا کرتا ہے—

جب دستورالعمل تیار ہوگیا تو منظوری کی غرض سے ری شی لیو کے پاس پیش کیا گیا-اس نے جملہ ضوابط کو سواے ایک کے منظور کر لیا اور یہ استثنا اس کے لئے قابل تعریف ہے-جس ضابطہ کو اس نے رد کیا اُس کا منشا یہ تھا کہ ''موجودہ اور آئندہ تمام اراکین اپنے سرپرست کے محاسن کی وقعت کریں اور اسے عزت کے ساتھہ یاد کریں'' چونکہ کارڈینل کا اعتقاد تھا کہ استحسان اور شکرگزاری کے جذبات قانون کے پابند نہیں ہو سکتے اس لئے اس نے اس ضابطہ ہی کو قلمزن کر دیا—

ضوابط مجلس کی رو سے کارڈینل ری شی لیو کو بانی اور سرپرست کی حیثیت دی گئی اور اس ادارۂ علمیہ کی مہر پر ایک طرف ری شی لیو کا چہرہ کندہ کیا گیا جس کے نیچے تاریخ قیام درج تھی دوسری جانب پھولوں کا ہار بنایا گیا اور چاروں طرف یہ عبارت کندہ کی گئی ''بقاے دوام''-یہی وجہ ہے

که اس مجلس کے اراکین کو مشترکہ طور پر "ابدی" کہا جاتا ہے۔ شاہ لوئی سیزدہم کے منشور کی رو سے جنوری سنہ ۱۶۳۵ع میں یہ مجلس "مجلس علمی فرانس" کے نام سے قائم ہوئی۔ ری شی لیو اس کا بانی ہوا اور اراکین کی تعداد چالیس مقرر کی گئی اور اس میں اج تک اضافہ نہیں ہوا ہے۔

مجلس نے جن ضوابط کو منظور کیا تھا اور فرمان شاہی کی رو سے جن کی تصدیق کی گئی تھی ان کی مجموعی تعداد جیسا کہ کہا جا چکا ہے پچاس تھی اراکین کی مساوات کے علاوہ مجلس کو انتخاب اراکین کی بھی کامل آزادی عطا کی گئی تھی لیکن ایک اور دفعہ سے اس میں کسی قدر ترمیم کی گئی تھی اس کا منشا یہ تھا کہ "تا وقتیکہ کوئی شخص سرپرست کی منظوری نہ حاصل کر لے اُس کا انتخاب رکنیت کے لئے نہیں کیا جاسکتا" ری شی لیو نے جو اپنی مدةالعمر انجمن کا سرپرست رہا اس دفعہ کا آزادانہ استعمال کیا اور انتخابات میں اس کا اثر بہت نمایاں رہا ہے۔ بعد ازاں جب بادشاہ وقت کو مجلس کا سرپرست بنایا گیا تو شاہی تردید انتخابات کو مسترد کر سکتی تھی لیکن اس کی نوبت شاذ و نادر آنے پائی اگر ایک طرف مجلس اس بات کا خاص لحاظ رکھتی تھی کہ ایسے لوگوں کا اُنتخاب عمل میں نہ آئے جو غیر معمولی طور پر "ناخوشگوار" ہوں تو دوسری جانب بادشاہ بھی مجلس کی آزادی میں زائد از ضرورت دخل اندازی سے محترز رہتا تھا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب شاہ لوئی چہاردہم کو یہ معلوم ہوا کہ ایک رکن کو بالاتفاق رائے منتخب کر لیا گیا ہے تو اس نے اپنے اعتراضات واپس لے لئے۔ لوئی پانزدہم کی سرپرستی کے زمانہ کا ایک واقعہ بھی اسی قسم کا ہے۔

———:o:———

آج کل "سرپرست" کے عہدہ کا ذکر نہیں آتا تاہم ایک حد تک مجلس سردار قوم کے حکم کو تسلیم ضرور کرتی ہے خواہ وہ صدر جمہوریت ہو یا

شاهنشاہ - جب عوام کو کسی جدید انتخاب کی اطلاع دی جاتی ہے تو سب سے پہلے یہ ضابطہ کے الفاظ اب تک نظر آتے ہیں کہ "اس انتخاب کے لئے سردار ملک کی اجازت حاصل کی جا چکی ہے" یہ بھی دستور چلا آتا ہے کہ شرکت کے بعد جدید رکن کا تعارف مجلس کا ناظم اور معتمد صدر یا شاہ وقت سے کراتا ہے اور اسے اپنی تقریر کی (جو شرکت کے وقت کی جاتی ہے) ایک نقل گزراننی پڑتی ہے آج کل یہ رسمی باتیں چنداں اہمیت نہیں رکھتیں اس وجہ سے کہ اراکین مجلس کو کسی خاص صدر سے ذاتی مخالفت کی کوئی وجہ نہیں ہے لیکن فرانس میں جب "شاہنشاہیت ثانوی" کا دور تھا اس وقت اس کی حیثیت خاص طور پر نازک اور پریشان کن تھی - اس وقت "ولی مین" کو جو ناظم مجلس تھا سابق روایات کے بموجب توی لیرز (قصر شاہنشاہی) جانا پڑتا تھا اور جدید اراکین کو بادشاہ کے سامنے پیش کرنا پڑتا تھا - لے کارڈیر - ڈی براگ لی - پرووسٹ پاراڈول اور جوئس فاورے اسی طرح پیش کئے گئے تھے —

اگرچہ مجلس اپنے اراکین کا انتخاب کرتی ہے لیکن وہ اپنی طرف سے کبھی اعزازات پیش نہیں کرتی جو لوگ اس مشہور مجلس میں شریک ہونا چاہتے ہیں انہیں باضابطہ داخلہ حاصل کرنا پڑتا ہے - یہ قاعدہ تقریباً ابتدا سے چلا آتا ہے - کہتے ہیں کہ بہت قدیم زمانے میں ایک دفعہ مجلس نے ایک شخص کے لئے اپنے یہاں کے اعزازات پیش کئے - لیکن اُس نے سیاسی وجوہات کے بنا پر اُن کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اُس انکار کو مجلس کے لئے باعث توہین سمجھا گیا اور یہ طے پایا کہ آئندہ سے اس کا موقع نہ آنے دیا جائے - ابتدا میں داخلہ کی اجازت حاصل کرنے کے لئے صرف معتمد کو ایک معمولی خط لکھنا کافی ہوتا تھا - لیکن رفتہ رفتہ داخلہ کا طریقہ پیچیدہ ہوتا گیا اور ہر امیدوار کا یہ فرض تھا (اور آج تک ہے) کہ وہ "ملاقاتیں" کرے - یہ ملاقاتیں باری باری سے ہر رکن مجلس کے ساتھ کرنا پڑتی تھیں اور اس کی موافق رائے کی استدعا کی جاتی

تھی - چالیس ملاقاتیں کرنا پڑتی تھیں ! یا یہ کہو کہ اُنتالیس - اس لئے کہ تاوقتیکہ کم از کم ایک جگہ خالی نہ ہو - داخلہ ہو ھی کس طرح سکتا تھا —

اکثر لوگوں کے لئے جو اپنی قابلیتوں کے اعتبار سے مشہور "گنبد" کے نیچے جگہ پانے کے مستحق تھے یہ ضوابط بسا اوقات شدید رکاوٹ بن جاتے تھے - بقول ایک فرانسیسی کے "مجلس کے دروازے بہت پست ھیں اور اگر کوئی شخص یہ چاھے کہ بغیر دیوار سے سر ٹکرائے ہوئے اُن میں سے نکل سکے تو اُسے بہت جھکنا پڑتا ھے" —

اب ھم اُس خاص مقصد سے بحث کرتے ھیں - جس کی تکمیل کے لئے یہ مجلس وجود میں آئی تھی - اس کے قیام کی خاص غایت کی منشور شاھی میں صاف طور پر یہ صراحت کی گئی ھے کہ "اُس کا کام یہ ھے کہ کمال احتیاط و کوشش سے فرانسیسی زبان کو ترقی دی جائے - اُس کو کثافتوں اور آلائشوں سے پاک کیا جائے - الفاظ کا استعمال معین کیا جائے - مختصر یہ کہ زبان کو فصیح اور علوم و فنون کی بحث کے قابل بنایا جائے" —

اس زمانہ میں یہ مقصد ھمیں کچھ زیادہ اعلیٰ و ارفع نظر نہیں آتا - لیکن اُس وقت جب زبان کافی طور پر معین نہ تھی - صورت برعکس تھی اور خود "رلی شی لیو" کے خیال میں یہ اعلیٰ ترین خدمت تھی جو یہ مجلس انجام دے سکتی تھی —

مذکورۂ بالا اغراض کی تکمیل و ترقی کے لئے یہ بھی طے کیا گیا کہ مجلس ایک لغت مرتب کرے - ایک قواعد زبان کی کتاب بھی لکھے اور فصاحت اور شاعری پر بھی رسالے شایع کرے - ھم یہ کہدینا چاھتے ھیں کہ نظم - فصاحت یا قواعد پر کوئی کتاب کبھی نہ لکھی گئی اور ان چیزوں کو قواعد و ضوابط کی پابندیوں میں جکڑنا ممکن بھی نہ ہوسکتا تھا - اس لئے کہ یہ چیزیں اُسی وقت

کسی قابل کہی جاسکتی ھیں جب آزادانہ و بلا قیود و شرائط خدا داد ذھانت سے پیدا ھوں- لغت کا آغاز البتہ ھوا اور اسے اس مجلس کی اھم ترین اور مفید ترین کاوش کہا جاسکتا ھے —

یہ سمجھہ رکھنا چاھئے کہ مجلس کی کاوشوں سے ھماری مراد افراد مجلس کی مشترکہ مساعی سے ھے- ورنہ انفرادی طور پر اس کے اراکین نے جو کچھہ خدمات کیں اُس کی تشریح نہ صرف بے محل ھے بلکہ ناممکن بھی ھے- اِس لئے کہ اس کی پیدائش کے وقت سے بجز چند مستثنیات کے وہ جملہ اھل قلم افراد اس کے اراکین رہ چکے ھیں جنھوں نے دنیاے علم میں کچھہ بھی مرتبہ حاصل کیا ھے اور اُن کی تصنیفات کی تاریخ لکھنا گویا فرانسیسی ادب کی تاریخ لکھنا ھے —

سنہ ۱۶۳۵ ع میں شاپلین * سے درخواست کی گئی کہ وہ لغت کا ایک خاکہ مرتب کرے- بعدازاں اُس کی اور دوسرے اراکین کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی- لیکن کام کی رفتار بہت سست رھی- حتی کہ بعض ظریفوں نے اس سستی سے عاجز آکر مجلس کو " نکموں کی مجلس " کا نام دے ڈالا- لغت کے کام میں " واگی لاس نے بھی اھم حصہ لیا- وہ اس کمیٹی کا صدر تھا جس کے ذمہ لغت کے خاکوں کی تیاری تھی اور مجلس کے ھر اجلاس میں یہ خاکے پڑھکر سنائے جاتے تھے- " واگی لاس نے سنہ ۱۶۴۹ ع تک جو اس کی وفات کا سال ھے- کامل دس برس کمال جانفشانی سے کام کیا اور اُس کی زندگی ھی میں کسی قدر کام ھو چکا تھا- لیکن اُس کے انتقال کے بعد سے یہ برابر سست ھوتا رھا —

---

* شاپلین کی تجویز جس پر لغت کی پہلی اشاعت میں عمل کیا گیا تھا موجودہ ترتیب سے مختلف ھے- بجاے تہجی کی ترتیب کے الفاظ کی ترتیب مادوں کے لحاظ سے کی گئی تھی- دوسری اشاعت میں یہ ترتیب خارج کردی گئی اور ترتیب تہجی قائم کی گئی —

محض اِس غرض سے کہ "واگی لاس" اپنا تمام وقت لغت کو دے سکے
"ری شی لیو" نے اُس کا وظیفہ جو پہلے جاری تھا لیکن پھر بند ہو چکا تھا
دوبارہ جاری کر دیا۔ جب وہ "کارڈی نیل" کا شکریہ ادا کرنے گیا تو حسب
ذیل لطیفہ آمیز گفتگو ہوئی "کارڈی نل" متانت آمیز تبسم کے ساتھ اُس سے
ملنے کے لئے بڑھا اور کہا "ایم۔ واگی لاس مجھے اُمید ہے کہ آپ لغت میں لفظ
Pension (پنشن) لکھنا نہ فراموش کریں گے" واگی لاس نے جھک کر تعظیم
ادا کی اور کہا "تقدس مآب! لفظ پنشن سے کہیں زیادہ مجھے لفظ Gratitude
(شکر گزاری) لغت میں لکھنے کا خیال رہے گا" کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ
"کولبرٹ" جو خود ایک رکن تھا۔ کمیٹی کے فقدان جوش کی وجہ سے مایوس ہوا
اور چونکہ بحیثیت ایک عملی شخص ہونے کے وہ یہ چاہتا تھا کہ ہر کام جو کرنے
کے لائق ہے فوراً ہو جانا چاہئے۔ اس لئے وہ دفعتاً مجلس کے دفتر میں پہونچ
گیا۔ اُس نے دیکھا کہ سب لوگ لفظ Ami کی تحقیق میں بہت مصروف ہیں۔ جب
اُس نے اُن کی بحثیں سنیں اور بطور خود اس کا بھی اندازہ لگا لیا کہ محض
ایک لفظ کی تعریف میں کس قدر غور و فکر۔ عرصہ اور محنت کی ضرورت
ہے۔ تب اُس کو اقرار کرنا پڑا کہ فی الحقیقت اُس کے قیاس کے مقابلہ میں کام
کہیں زیادہ پیچیدہ ہے اور وہ بغیر زجر و توبیخ کئے ہوئے واپس ہوا۔

———:o:———

لغت کا کام کچھ اوپر تیس سال بعد یعنی سنہ ۱۶۷۲ ع میں ختم ہوا اور اس
کے دو سال بعد ہی شاپلین نے جو ابتدا ہی سے اس کے ترقی دینے والوں میں سے تھا
اور جسے مرتے دم تک لغت کے ساتھ گہری دلچسپی رہی انتقال کیا۔
بد قسمتی سے جب لغت مکمل ہو چکی تو یہ بات معلوم ہوئی کہ اس کے ابتدائی
حصے جو اُس وقت مرتب کئے گئے تھے جب کہ فرانسیسی زبان نے کوئی معین
صورت اختیار نہ کی تھی متروکات سے بھرے ہوئے ہیں چنانچہ پوری لغت کی

نظر ثانی اور کہیں کہیں نئے سرے سے لکھنے کی ضرورت ہوئی-اس کام میں بیس سال اور صرف ہوگئے اور یہ لغت اپنی مرتب و مکمل حیثیت میں سنہ ۱۶۹۴ ع سے قبل (یعنی اپنی ابتدا کے پچاس سال بعد) شایع نہ ہوسکی-اٹھارویں صدی میں اس کے جدید اڈیشن وقتاً فوقتاً چھپتے رہے-ایک اور اڈیشن سنہ ۱۸۳۵ ع میں نکلا اور جدید ترین یعنی ساتواں اڈیشن سنہ ۱۸۷۷ ع میں شایع ہوا-اشاعت کے بعد ہی سے یہ کتاب فرانسیسی زبان کا معیار تسلیم کی گئی اور آج تک مستند چلی آتی ہے-جو لفظ اس کے صفحات میں نہ پایا جائے اُس کے لئے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اُسے باقاعدہ طور پر باقی رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے-گون کورت اس خیال کا مخالف ہے-اس کی راے ہے کہ "چونکہ فرانسیسی زبان اپنے سرمایہ کے اعتبار سے السنۂ جدیدہ میں سب سے زیادہ غریب ہے اس لئے کم از کم میں کسی ایسے لفظ کو قبول کرنے سے انکار نہیں کرسکتا جس میں اداے مطلب کی صلاحیت پائی جائے-خواہ اُسے مجلس علمی کی گاڑی میں سوار ہونا * نہ نصیب ہوا ہو" —

لغت کی بحث ختم کرنے سے پہلے اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ موجودہ مجلس نے ایک جدید اور جامع ترین لغت مرتب کرنے کا خیال کیا تھا-چنانچہ کام بھی شروع کردیا گیا تھا-لیکن یہ دیکھ کر کہ اس کی تکمیل میں کئی سال صرف ہوجائیں گے کچھ عرصہ ہوا کہ "مجلس" علمی اس کام سے دست بردار ہوگئی ہے—

زبان کی نشوونما کے خیال سے ایک قاعدہ یہ بھی مقرر کیا گیا تھا کہ

---

* یہ فقرہ کسی قدر تلمیح طلب ہے-شاہ لوئی چہاردہم کے عہد حکومت میں یہ دستور تھا کہ جب بادشاہ ہوا خوری کو جاتا تھا تو اپنے ساتھ چند خاص خاص اور ملحوظ نظر مقربین کو بٹھا لیتا تھا-پس یہ جملہ " شاہی گاڑی میں سوار ہونا " الطاف و مراحم خسروانہ کے اظہار کے لئے استعمال ہوتا ہے—

ہر رکن باری باری سے ہفتہ میں ایک مرتبہ پوری مجلس کے سامنے تقریر کیا کرے۔اس رسم کو تو بہت جلد ترک کر دیا گیا۔لیکن ایک اور رسم قیام مجلس سے آج تک بدستور چلی آرہی ہے۔یعنی جدید اراکین کے استقبال کے وقت تقریروں کا ہونا۔ابتدا میں یہ جلسے مخصوص حیثیت رکھتے تھے۔لیکن بقول پرالت (جوکہ پریوں کی کہانیوں کا مشہور مصنف ہے) جو تقریر اُس نے اپنے داخلہ کے وقت کی تھی وہ اگرچہ اپنی فصاحت کے اعتبار سے سب کو پسند آئی لیکن خود اسکو یہ افسوس رہا کہ ایک محدود جماعت ہی نے اسے سنا۔ چنانچہ اُس نے تجویز کی کہ آئندہ سے اس قسم کے استقبالی جلسے عام ہوا کریں۔ اُس کی درخواست منظور کی گئی اور آج تک یہ کیفیت ہے کہ جب کبھی مجلس علمی کسی جدید رکن کا استقبال کرتی ہے تو عوام کی طرف سے بہت کچھہ دلچسپی اور جوش کا اظہار کیا جاتا ہے۔خواتین خاص طور سے شرکت کے لئے بے چین رہتی ہیں اور ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے ہفتوں پہلے سے گھروں میں سازشیں شروع ہوجاتی ہیں اور حق یہ ہے کہ یہ موقع بھی کچھہ کم تفریح آور اور مسرت انگیز نہیں ہے۔کیونکہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ان تقریروں کو خطابت اور فصاحت کا شاہ کار کہا جاسکتا ہے اور پرانے زمانہ کی طرح جب بوسوے کی تابش الفاظ اور رے سی نی کی فصاحت لوگوں کو مسحور کر دیا کرتی تھی آج بھی ری نین کی شوکت الفاظ اور پے لی ران کی ظرافت سامعین سے خراج تحسین وصول کیا کرتی ہے۔جدید رکن کی تقریر ہمیشہ اپنے مرحوم پیش رو کی تعریف میں ہوتی ہے اور اس مشہور مجلس کا فصیح ترین رکن مجلس کی طرف سے اس کا جواب دیتا ہے۔

———:o:———

قیام مجلس کے کچھہ عرصہ بعد ری شی لیو کی سرپرستی کے زمانہ میں وہ واقعہ پیش آیا جو (Cid) سد کے واقعہ کے نام سے مشہور ہے۔سنہ ۱۶۳۶ ع

میں یہ ناٹک جو کارنیلی کا شاہ کار ہے پہلی مرتبہ کھیلا گیا۔اسے ھاتوں ھاتھہ لیا گیا اور نوجوان مصنف کو پوری شہرت حاصل ہوئی۔ لیکن ری شی لیو کو یہ کھیل کچھہ زیادہ پسند نہ تھا۔ اور اس نے شدت سے اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔ غالباً اس ناراضی کی وجہ یہ تھی کہ فرانس میں خانہ جنگیوں کا بہت کچھہ زورشور تھا اور کارڈی نیل ری شی لیو نے اس کی روک تھام میں اپنی پوری قوت صرف کی تھی۔لیکن اس املیہ کی دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ یہ ھے کہ اس میں ایک خانہ جنگی کا واقعہ بطور پلاٹ کے موجود ھے * —

یم اسکدری نے جو خود بھی ایک بلند پایہ مصنف تھا اس ڈرامے پر سختی سے تنقید کی۔اس کی کچھہ وجہ تو اُس کا اپنا علمی رشک تھا اور کچھہ کارڈی نیل کی خوشنودی کو بھی اس میں دخل تھا۔ری شی لیو نے مجلس علمی سے خواھش کی وہ اس کتاب کے متعلق اپنی راے ظاھرکرے۔انفرادی طور پر اکثر اراکین مجلس سڈ کو پسند کرتے تھے۔مثلاً جب ایبے ڈی کے ری سی سے کسی نے اس کتاب کے متعلق راے دریافت کی تو اُس نے جواب دیا "کاش میں اس کا مصنف ھوتا" لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ری شی لیو جس چیز کا آرزومند ھے وہ آزادانہ تنقید نہیں۔بلکہ عیب جوئی ھے اور چونکہ وہ مجلس کے اتنے بڑے محسن کو ناراض کرنا نہ چاھتے تھے۔لہذا بہت عرصہ تک یہ عذر کرتے رھے کہ "ضوابط مجلس اس وقت تک کسی کتاب پر تنقید کی اجازت نہیں دیتے جب تک کہ خود مصنف تنقید و تبصرہ کی خواھش نہ کرے"—

لیکن بھلا ری شی لیو کب کسی عذر کو سنتا تھا۔وہ برابر مصر رھا۔اس نے

---

* بعض لوگوں کا خیال ھے کہ ری شی لیو Cid کی مقبولیت کو حسد کی نظروں سے دیکھتا تھا کیونکہ جیسا کہ ھم اس سے قبل بتا چکے ھیں۔اُسے بھی علمیت کا دعویٰ تھا اور اُس نے بھی ایک سے زیادہ ناٹک گمنام طور پر لکھے ھیں جو کہ قصر شاھی میں کھیلے گئے تھے۔علاوہ اس کے اس نے چند ڈراموں کا خاکہ بھی مرتب کیا ھے —

ہوا اس رابرٹ کو کارنیلی کے پاس بھیجا اور اُس سے بجبر تنقید کی اجازت حاصل کی۔ کارنیلی نے جن الفاظ میں اجازت دی وہ یہ تھے ”اراکین مجلس کا جوجی چاہے کریں اور چونکہ بقول آپ کے تقدس مآب کو بھی اُن کی راے معلوم کرنے کا اشتیاق ہے۔ لہذا مجھے کچھ کہنا سننا نہیں ہے“ اب تو بمجبوری مجلس کو تنقید کرنی پڑی۔ لیکن چھ مہینے سے پہلے اُن کی آخری راے کسی کو معلوم نہ ہوسکی۔ شاپلین نے حسب دستور اس مرتبہ بھی نہایت سرگرمی کے ساتھ کام کیا اور وہ یادداشت جو کارڈی نیل کے ملاحظہ کے لئے پیش کی گئی تھی اسی کی مرتب کی ہوئی تھی۔ ان یادداشتوں میں سڈ کے اکثر حصوں کو ہدف ملامت بنایا گیا اور جو کچھ باقی رہا تھا اس کی مٹی ادھوری تعریف کرکے خراب کی گئی* —

اس فیصلہ کی کل وجز غرض کارڈی نیل کی خوشنودی حاصل کرنا تھی۔ کیونکہ اکثر اراکین مجلس اور خود شاپلین بھی اپنے نجی کے خطوط میں کارنیلی کی تصنیف کے مداح نظر آتے ہیں۔ مذکورۂ بالا یادداشت بعد کو ”سڈ پر مجلس علمی کے خیالات“ کے نام سے علیحدہ شایع ہوئی۔ مجلس علمی کی کوئی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں کہی جاسکتی جب تک وہ سڈ کے واقعہ پر روشنی نہ ڈالے۔ شروع ہی سے یہ واقعہ مجلس علمی کے مخالفوں کے ہاتھوں میں ایک کارآمد حربہ بنا ہوا ہے۔ مجلس علمی میں آزادی راے کے فقدان کو وہ اسی واقع سے ثابت کرتے رہتے ہیں اور ہمیشہ اُس منقادانہ بلکہ غلامانہ روش کو مطعون کرتے رہتے ہیں جو سرپرست مجلس (یعنی ری شی لیو) کے مقابلہ میں ظاہر کی گئی۔ خواہ وہ سرپرست وزیر سلطنت یا خود شاہنشاہ ہی کی حیثیت کیوں نہ رکھتا ہو۔ اس موقع پر شاپلین نے سب اراکین سے زیادہ ہوشیاری سے کام کیا۔

---

* مجلس علمی نے جس پہلو کو سامنے رکھکر سڈ پر اعتراضات کئے وہ یہ تھا کہ ”یہ تصنیف اصول فن کے منافی ہے“—

اور بہت خوبی کے ساتھہ ہوا کے رخ اپنا جہاز چلایا۔ ری شی لیو کے نام جو خطوط اس نے لکھے ہیں وہ انتہا درجہ کے خوشامدانہ ہیں اور انہیں پڑھکر تعجب ہوتا ہے کہ حقیقی قابلیت اس طرح سے اقتدار کے سامنے سر نیاز جھکائے! یہ سب کچھہ سہی - لیکن ہمیں اس معاملہ میں سختی کے ساتھہ گرفت بھی نہ کرنا چاہئے - یہ لوگ لاکھہ کچھہ ہوں پھر بھی انسان ہی تھے اور تقاضائے بشریت سے مجبور - نیز یاد رکھو کہ یہ وقت وہ تھا جب کہ ادیب اور ادبیات کسی کی کچھہ زیادہ پروا نہ کی جاتی تھی اور اُن کے سر پرست کا اقتدار ہمہ گیر تھا!

———:o:———

بہرحال مجلس علمی نے بہت جلد سلطنت میں اپنا اثر پیدا کرلیا اور اس کی برکت سے طبقۂ اعلیٰ کے افراد میں بھی علم کی چاٹ پیدا ہوگئی جو بلند مرتبہ اس نے اُس زمانہ میں حاصل کیا تھا وہ کبھی اس کے ہاتھہ سے نہیں گیا ہے - اور اُن ممالک کی فہرست میں جہاں خداداد ذہانت اور فطری طباعی کو ان کے مناسب حال رتبہ دیا جاتا ہے فرانس کا نام سب سے اُوپر لکھا ہوا نظر آئے گا —

سنہ ۱۶۴۲ ع میں جب ری شی لیو کا انتقال ہوا تو چانسلر سی گی یر کو جو پہلے سے مجلس کا رکن بھی تھا سرپرست بننے کی دعوت دی گئی - اُس نے اِسے قبول کیا - لیکن ساتھہ ہی حق رکنیت سے دست بردار ہوگیا تاکہ آپس میں کوئی فرق مساوات محسوس نہ ہوسکے —

یہ پہلا موقع تھا کہ مجلس علمی کو ایک ٹھکانے کا مکان نصیب ہوا - ابتداء قیام سے اِس کے جلسے کسی نہ کسی رکن کے مکان پر ہوا کرتے تھے اور اس انتظام میں ہمیشہ ردوبدل کی ضرورت رہا کرتی تھی - سی گی یر نے خود اپنا محل پیش کیا اور اُس وقت سے تیس سال تک وہیں جلسے ہوتے رہے - مجلس علمی اپنے جدید سرپرست سے اتنی خائف نہ تھی جتنی کہ کارڈی نل سے -

اگرچہ مجلس چانسر کی بہت کچھہ تعظیم کرتی تھی اور تمام متنازعہ فیہ مسائل پر اُس کی راے کو قطعی تسلیم کرتی تھی - لیکن " خود چانسلر نے کبھی مجلس کی آزادی میں دست اندازی نہ کی " —

سنہ ۱۶۷۲ ع میں جب اُس کا انتقال ہوا تو مجلس علمی بہت کچھہ شہرت حاصل کر چکی تھی بہت سے مشاہیر عصر اسکے اراکین کی صف میں مل چکے تھے - خود شاہ لوئی چہاردہم نے جسکے شباب و عظمت کا آفتاب اسوقت نصف النہار پر تھا سرپرست بننے کی خواہش کی - مجلس نے اس شرف کو بہت خوشی اور فخر کے ساتھہ منظور کیا اور سب اراکین ایک ساتھہ مل کر بادشاہ کا شکریہ اداکرنے کے لئے قصر شاہی میں حاضر ہوئے —

———— :o: ————

لوئی اُن کے ساتھہ کمال اخلاق سے پیش آیا جب اُس کی نظر اپنے مشہور وزیر " کول برٹ " پر پڑی جو رکن مجلس علمی کی حیثیت سے اپنی جگہ پر موجود تھا تو اُس نے اُسے حکم دیا کہ جن ممبروں سے میں واقف نہیں ہوں اُنھیں باری باری سے میرے حضور میں پیش کرو - پھر اُسے علیحدہ بلا کر کہا " مجھے بتلاؤ کہ میں ان اصحاب کے ساتھہ کس تلطف سے پیش آؤں " حقیقت یہ ھے کہ کولبرٹ نے اپنا تمام رسوخ ادب و فن کی ترقی میں صرف کیا اور ہمیشہ علم کا زبردست حامی و سرپرست رہا —

خود بادشاہ بھی مجلس کے ساتھہ مراحم خسروانہ سے پیش آتا رہا - اُس نے انجمن کے لئے ایک شاہی محل وقف کردیا اور اس کے فرمان کے بموجب اُس وقت سے مجلس علمی کے جلسے قصر " لوور " کے دارالشوری میں ہونے لگے - شاہ لوئی ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھتا تھا - مثلاً پہلے صرف ناظم مجلس کو آرام کرسی ملتی تھی اور دوسرے اراکین کے لئے چھوٹی چھوٹی کرسیاں تھیں جو بقول مورخ مجلس علمی " بہت تکلیف دہ تھیں " کاردی نیل دی

استریس نے شہنشاہ کے حضور میں عرضداشت پیش کی کہ "بوجہ ضعف و کبرسنی مجھے بھی آرام کرسی مرحمت فرمائی جائے ورنہ حاضری سے قاصر رہوں گا" بادشاہ نے نہ صرف اس درخواست کو منظور کیا بلکہ اپنے محل سے چالیس آرام کرسیاں بھجوادیں تاکہ آپس میں رقابت نہ پیدا ہونے پائے "چالیس آرام کرسیوں" کا محاورہ اسی وقت سے رائج ہے اور اکثر مجلس علمی اُسی نام سے مخاطب کی جاتی ہے—

———:o:———

اگر کارڈی نیل ری شی لیو نے مجلس علمی کو سلطنت میں باا ثر بنا دیا تھا تو شاہ لوئی نے جس کا قول تھا کہ "میں خود ریاست ہوں" اُسے بڑھا کر اپنے ذاتی مرتبہ کی بلندی تک پہونچا دیا۔ اُس کا حکم تھا کہ ہر دربار اور دوسری رسومات سلطنت کے موقع پر چھہ اراکین مجلس علمی کی نمائندگی کیا کریں۔ مختصر یہ کہ مجلس علمی کے لئے جسے وہ "میری مجلس!" کہا کرتا تھا وہ کوئی رعایت اٹھا نہ رکھتا تھا—

کہتے ہیں کہ شاہ لوئی کو فصاحت اور شاعری کا خاص شوق تھا۔ لیکن بقول مورخ "جب یہ چیزیں اُس کے لئے استعمال کی جاتی تھیں تو یہ شوق عشق کی حد تک پہنچ جاتا تھا" چنانچہ صاف ظاہر ہے کہ اِس زمانہ میں جس کا حال ہم اب لکھہ رہے ہیں انجمن کے مقاصد و اغراض وہ نہ رہے تھے جو قیام کے وقت تھے۔ فصحائے مجلس فتوحات شاہی کے اعلان سے کبھی نہ تھکتے تھے اور شعرائے مجلس کو سوائے اوصاف شاہی کی قصیدہ خوانی کے اور کوئی کام نہ تھا—

حق یہ ہے کہ یہ شوق آستان بوسی جو پرستش کی حد تک پہونچ گیا تھا آج کل نہ صرف ناقابل یقین بلکہ مضحکہ خیز نظر آتا ہے اور اس شاندار ادارۂ علمی کے دامن پر ایک بدنما دھبہ معلوم ہوتا ہے ہم صرف اسی قدر کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت احساسات کی عام رو یہی تھی اور یہ مجلس بھی اپنا دامن

اس سے نہ بچا سکی۔ دنیٰ سے ایکر اعلیٰ تک ہر طبقہ دیوتا کی طرح شاہ لوئی چہاردہم کی پرستش کرتا تھا اور جب رے سینی جیسے بلند رتبہ شاعر کی نسبت ہم یہ پڑھتے ہیں کہ وہ محض اس صدمہ کی وجہ سے جانبر نہ ہو سکا کہ "بادشاہ نے اس پر نظر عتاب ڈالی تھی" تو ہمیں اس جوش عقیدت کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے—

———:o:———

فتاب شاہنشاہیت کی ضیاباریوں نے (شاہ لوئی Sun-King بادشاہ سورج کہلاتا تھا) مجلس علمی کے حق میں مسیحائی کی اور اس میں شک نہیں کہ یہ زمانہ فرانسیسی ادبیات کی تاریخ میں عہد زرین کہلائے جانے کا مستحق ہے۔کیا مجلس علمی اپنے منشاء تخلیق یعنی فرانسیسی زبان کی ترقی کو پورا کر چکی تھی؟ بیشک۔کیونکہ اس کے پینتیس سالہ قیام میں زبان نے زبردست ترقی کی تھی بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ارتقاء اور حسن کی معراج پر پہونچ گئی تھی۔بوسوے کے پر شکوہ خطبات اور رے سینی کے المیہ قصوں کی فصاحت یہ ایسی باتیں ہیں جنھیں آج تک کوئی نیچا نہ دکھا سکا اور جن کی نظیر شاذ و نادر ملتی ہے—

———:o:———

اس اثنا میں فرانس میں ایک ایسا روح پرور جھونکا آیا جس نے فرانسیسی ادبیات کے حق میں اعجاز مسیحائی کا کام کیا۔ملک میں ہر طرف سے خداداد ذھانتیں اُبھرنے لگیں اور اُنھوں نے دنیا کے سامنے ایسی تصنیفات پیش کیں جو رہتی دنیا تک باقی رہیں گی۔خود مجلس علمی کی چار دیواری کے اندر رے سینی۔بوائے لو۔لابروائی یر۔فی نی لون اور ان سب کے سرتاج یعنی بوسوے جیسے باکمال پیدا ہوئے۔فی الحقیقت یہ صدی ایک یادگار صدی ہے اگر ایک طرف شاہ لوئی کی فتوحات تھیں تو دوسری طرف آسمان علم کے درخشاں ستاروں

نے اس میں چار چاند لگا دئے تھے —

———:o:———

اراکین علمی کو معاوضہ سب سے پہلے کولبرٹ کے زمانے سے ملنا شروع ہوا جب کارڈی نیل نے اس مجلس کا افتتاح کیا تو اس وقت کسی قسم کا معاوضہ مقرر نہ تھا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ری شی لیو میں مغیرانہ جذبات کی کمی تھی کیونکہ وہ خود اکثر علمی افراد کو وظائف دیا کرتا تھا بلکہ اس کی اصل غرض یہ تھی کہ یہ مجلس ایک آزاد جماعت رہے اور بوالہوس لوگ ہوس زر سے اس میں شرکت کی کوشش نہ کریں لیکن کولبرٹ انتہا درجہ کا با عمل شخص تھا جب اس نے اراکین کی حاضری کو ابتر دیکھا۔ کیونکہ بقول مورخ "کچھہ لوگ اس وقت داخل ہوتے تھے جب دوسرے رخصت ہوتے تھے" تو اُس نے ایک رجسٹر حاضری تیار کرایا اور ہر ممبر سے درخواست کی گئی کہ وہ داخل ہوتے ہی اپنا نام اس پر لکھہ دیا کرے۔اس کے حکم کے بموجب مجلس کے ہر اجلاس کے موقع پر چالیس چاندی کی ٹکیاں تقسیم کی جاتی تھیں۔ جو لوگ غیر حاضر ہوتے تھے اُنھیں کچھہ نہ ملتا تھا اور اُن کا حصہ مساوی طور پر حاضرین میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر صرف ایک ضعیف العمر رکن حاضر تھا اور کمال مسرت کے ساتھہ چالیسوں ٹکیاں سمیٹ کر لے گیا —

کولبرٹ کے اس خیال کی اکثر اراکین نے بھی مخالفت کی کیونکہ وہ ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں مجلس کی آزادی میں کوئی خلل نہ واقع ہو لیکن چونکہ خود یہ رقم بہت حقیر تھی یعنی زیادہ سے زیادہ چند سو فرانک سالانہ۔اس لئے آخر سب نے اس اختراع کو قبول کر لیا۔اس بحث کو چھوڑنے سے پہلے ہم اتنا اور کہدینا چاہتے ہیں کہ آج کل اراکین کو سالانہ پچاس پونڈ ملتے ہیں۔اس کے علاوہ ہر ماہ کے آخر میں کچھہ معمولی سی رقم ان لوگوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے جن کی حاضری سب سے زیادہ باقاعدہ رہی ہو۔اس سے صرف ٹکیوں

کی قدیم رسم کا باقی رکھنا مقصود ہے—

———:o:———

لوئی چہار دہم کی وفات کے بعد اس کے جانشین لوئی پانزدہم اور لوئی شانزدہم باری باری سے مجلس کے سرپرست رہے۔یہ مجلس بحیثیت ایک جماعت کے اُن ادبی خیالات کی مخالف نہ تھی جو اٹھارھویں صدی میں دفعتاً اُبل پڑے۔مذہب فلاسفہ کے تمام خاص خاص افراد سوائے روسو کے اس کی چھت کے نیچے جگہ پا چکے ہیں۔لوئی ہفدہم کا زمانہ بھی مجلس کے لئے سکون اور اطمینان کا زمانہ ثابت ہوا لیکن اِس کے برے دن تیزی کے ساتھ نزدیک آتے جا رہے تھے اور جس انقلاب نے کہ شاہنشاہیت کو اُکھاڑ پھینکا اور مذاہب کو مٹا دیا اُس سے بھلا فرانس کی سب سے بڑی مجلس کس طرح بچ سکتی تھی۔یوں تو یہ مجلس اپنی فیاضی اور رحم کے جذبات کے لئے ہمیشہ مشہور رہی ہے لیکن اس موقع پر یہ خاص طور سے مستحق ستائش و تعظیم ہے۔اگرچہ اس کے بعض اراکین کے سروں میں انقلاب کی ہوا کسی قدر سمائی ہوئی تھی لیکن ان میں کا ایک فرد بھی اُس خونی جماعت کا شریک کار نہ ہوا جس نے شاہ لوئی کی موت کا فتویٰ کر دیا تھا اور فرانس کے مایۂ ناز فرزندوں کو سولی پر چڑھوا دیا تھا—

———:o:———

سنہ ۱۷۹۳ع میں جسے بجا طور پر آشوب فرانس (Reign of Terror) کا نام دیا جاتا ہے اس مجلس کے معدودے چند اراکین پیرس میں باقی رہ گئے تھے بعضوں کا انتقال ہو چکا تھا اور اُن کی جگہیں خالی تھیں۔کچھ موت کے گھاٹ اُتار دئے گئے تھے اور کچھ جلا وطن ہو چکے تھے پھر بھی جو کچھ دو چار اراکین بچے تھے وہ حسب دستور ہفتہ میں ایک مرتبہ اکھٹا ہوا کرتے تھے مارلت نے جو اس وقت ناظم کے فرائض انجام دیتا تھا جب یہ دیکھا کہ اب طوفان آنے ہی والا ہے

تو اس نے کمال حزم و دوراندیشی سے انجمن کے تمام کاغذات فرامین وغیرہ ایک محفوظ مقام پر رکھدئے اور اس طرح اُنھیں تباھی سے بچا لیا۔ کیونکہ ۸ اگست سنہ ۱۷۹۳ع کو ایک فرمان صادر ھوا کہ یہ انجمن ایک بے فائدہ چیز ھے لھذا اسے توڑ دیا جائے۔ مجلس کے دروازے مقفل کردئے گئے اور اعلان کر دیا گیا کہ "مجلس علمی نیز تمام علمی انجمنوں کا مال و اسباب سب جمہوریت کی مالک ھو گیا ھے"۔۔

———:o:———

لیکن خدا خدا کر کے یہ پر آشوب زمانہ ختم ھوا اور اس مجلس کی تنسیخ بھی عارضی ثابت ھوئی کیونکہ دو سال کے اندر ھی اندر یعنی سنہ ۱۷۹۵ع میں مجلس ملیہ کے حکم کی بنا پر ایک مجلس قائم کی گئی اور اس کی بدولت اُن تمام مجلسوں کو جو دو سال پہلے فنا کر دی گئی تھیں نئے سرے سے زندگی ملی۔ اس نئی انجمن کو (L' Institut d' France) "ادارۂ علمیۂ فرانسہ" کا نام دیا گیا۔ اسے تین شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ان میں سے ایک کسی حد تک مرحوم مجلس علمی کی نمائندگی کرتا تھا۔۔

سنہ ۱۸۰۳ع میں جب نپولین اول صدر اعظم ھوا تو اس نئی انجمن میں بہت کچھہ اضافہ اور ترمیم ھوئی۔ اس وقت اس کے چار شعبہ کئے گئے اور قدیم مجلس علمی کو ایک علیحدہ شعبہ یعنی نمبر ۲ دیا گیا اور اس کا نام "شعبہ زبان و ادبیات فرانسہ" رکھا گیا اور دراصل یہ شعبہ مجلس علمی ھی تھی جس کا نام بدل دیا گیا تھا۔ اسی زمانہ میں بہت سے پرانے قواعد و ضوابط دوبارہ رائج کئے گئے۔۔

———:o:———

نپولین مجلس علمی کے احیاء کا موید تھا لیکن ساتھہ ھی اسے یہ بھی آرزو تھی کہ ھر جگہ کی طرح یہاں بھی وہ سیاہ سفید کا مالک رھے اور کبھی

کبھی تو وہ بہت سخت گیر مالک ثابت ہوتا تھا- پھر بھی ان اراکین مجلس کو ہزار آفریں ہے جنھوں نے اُس کی خواہشات کو اپنے ضمیر کے منافی پاکر اُن کا سختی کے ساتھہ مقابلہ کیا- دلیل نے اُس کے مظالم کی قصیدہ خوانی سے صاف انکار کر دیا- سوارد پر جب ڈیوک آن گین کی پھانسی کے بعد زور ڈالا گیا کہ وہ ایک مضمون لکھے تاکہ عام احساس وفاداری میں جہاں رخنہ پڑ گیا ہے پھر استحکام پیدا ہو جائے تو اُس نے بھی صاف انکار کر دیا- لیکن ان سب سے زیادہ دلیرانہ مقابلہ شاتوبرایان نے کیا- اُس کے انتخاب کے بعد ایک دن اُس کے استقبال کے لئے مقرر کیا گیا اور اس موقع کے لئے اُسے حسب دستور ایک خطبہ تیار کرنا پڑا- نپولین نے اس کی نقل بغرض ملاحظہ طلب کی- اس خطبہ کا اکثر حصہ آزادی کی تعریف میں تھا- اس کا ذکر نہایت پر جوش الفاظ میں کیا گیا تھا اور علم کی نمو کے لئے اُسے اُتنا ہی ضروری بتایا گیا تھا جتنی کہ ہوا زندگی کے لئے ہے- اس خطبہ کا خاتمہ اس طرح ہوا تھا "پس آزادی علم و فن کی فطری دولت ہے اور جب اسے جمہور کے درمیان سے بزور بھگا دیا جاتا ہے تو یہ جمہور ہی میں پناہ لیتی ہے" نپولین اسے پڑہ کر آگ بگولہ ہو گیا- اُس نے کہا "اگر یہ خطبہ عوام کے سامنے پڑھا گیا ہوتا تو میں مجلس علمی کو نیست و نابود کر ڈالتا اور شاتوبرایان کو تاریک ترین تہ خانہ میں پھنکوا دیتا" اُس نے فوراً ناظم مجلس کو طلب کیا اور اُس سے کہا "کیوں جناب! یہ آپ کی مجلس کو سیاسی مجلس بننا کب سے نصیب ہوا؟ یہ نظمیں لکھے اور زبان کی غلطیاں درست کرے لیکن اگر اُس نے اپنی حد سے آگے پاؤں بڑھائے تو بہت جلد ڈھکیل دی جائے گی وغیرہ" بالاخر مسودہ شاتوبرایان کے پاس واپس بھیج دیا گیا- خود نپولین نے اپنے قلم سے اس کی تصحیح کی تھی اور قابل اعتراض مقامات کو بڑی بڑی ترچھی لکیروں سے کاٹ دیا تھا- مجلس کی خواہش تھی کہ شاتوبرایان دوسرا خطبہ تیار کرے لیکن اس نے رکھائی کے ساتھہ انکار

کر دیا۔ اگرچہ اُس کا انتخاب فسخ نہیں کیا گیا تاہم اس کی توثیق بھی نہ ہوسکی اور جب تک کہ سلطنت کا خاتمہ نہ ہو لیا اُس نے مجلس میں جگہ قبول نہ کی۔ عود شاہنشاہیت کے بعد مجلس کو سابقہ حقوق حاصل ہوئے۔ اُس کے پرانے ضوابط پھر رائج ہوئے اور اس کا قدیم نام ''مجلس علمی'' جو اس کے کارناموں سے مشہور ہو چکا تھا لیکن انقلاب کے بعد سے مٹا دیا گیا تھا اُسے دوبارہ ملا۔ شاہ لوئی ہیزدہم نے حسب روایات قدیم اس کی سرپرستی قبول کی اور اس کے بعد اُس کا جانشین چارلس دہم سرپرست ہوا۔

———:o:———

وہ فرمان شاہی جس کی رو سے لوئی ہیزدہم نے اس مجلس کی تجدید کی تھی ۲۱ مارچ سنہ ۱۸۱۶ع کو صادر ہوا لیکن اس تجدید کی یاد کے ساتھ ملی جلی چند افسوس ناک واقعات کی یاد بھی اسی وقت سے چلی آتی ہے۔ بنا بر حکم شاہی اراکین کی فہرست سے گیارہ نام خارج کر دئیے گئے گویا کہ یہ لوگ ہمیشہ کے لئے مجلس سے باہر کر دئیے گئے۔ اسی حکم کے بموجب چند نئے اراکین زبردستی شریک مجلس کئے گئے حتیٰ کہ کسی رسمی انتخاب کی بھی زحمت گوارا نہ کی گئی۔ ہمیں شاید اس صراحت کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں ہے کہ خارج شدہ اراکین وہ تھے جو یا تو انقلاب پسند جماعت میں شریک تھے یا پھر شاہ نپولین کے حامیوں میں سے تھے! اور ان کی جگہ جن اراکین نے لی وہ سب کے سب انتہا درجہ کے ''شاہ پسند'' تھے اور ان میں سے اکثر کی شرکت کا سبب ان کی ادبی خصوصیات اتنی نہ تھیں جتنا کہ ان کے سیاسی رجحانات۔ یہ ایک ایسا غیر منصفانہ طرز عمل تھا کہ اس کی طرف سے چشم پوشی کرنا کسی صورت سے ممکن نہیں ہے اور یہ بات کہ مجلس نے اپنے ضوابط اور آزادیوں کو اس طرح پامال ہوتے ہوئے دیکھا اور کسی قسم کا احتجاج نہ کیا اس قدیم مجلس کے دامن پر ایک نہایت بدنما دھبہ بنکر آج تک قائم ہے۔

لیکن جب چارلس دھم کے زمانہ میں سنہ ۱۸۲۷ع میں فرانسیسی حکومت کی طرف سے مجلس نائبین کے سامنے ایک تحریک پیش کی گئی جس سے پیرس کی آزادی میں خلل واقع ہوتا تھا تو مجلس علمی کا رویہ مذکورۂ بالا طریق عمل سے مختلف تھا۔ابھی مجلس نائبین اس قانون کے مسودہ پر غور بھی کرنے نہ پائی تھی کہ مجلس نے متفقہ طور پر اس دست اندازی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔جتنے اراکین پیرس میں موجود تھے اُن سب کا ایک جلسہ کیا گیا۔ایم بدک ری تیلی نے ایک پر زور تقریر کی۔اُس نے کہا ”کیا بادشاہ وقت اس کا مجاز ہے کہ جب اس کا جی چاہے فرانس میں آزادی خیالات کو سلب کرے“ اس تقریر کے خاتمہ پر بالاتفاق رائے یہ طے پایا کہ بادشاہ کے حضور میں ایک عرضداشت پیش کی جائے۔اس کو مرتب کرنے کی غرض سے تین اراکین کا انتخاب عمل میں آیا۔ناظم مجلس نے عرضداشت پیش کرنے کی غرض سے باریابی کی اجازت طلب کی لیکن بادشاہ نے اُس سے ملنے سے انکار کردیا۔جن تین اراکین نے اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا اُن کے ساتھہ بہت کچھہ سختی کی گئی اور اُنھیں عہدوں سے برطرف کردیا گیا تاہم یہ تجویز منظور نہ ہوسکی اور مجلس نائبین کی مخالفت کی وجہ سے حکومت نے اُسے واپس لے لیا—

———:o:———

اس واقعہ کے بعد ہی سے نہ صرف مجلس علمی کے تفکرات اور تقریروں میں بلکہ اُس کے اراکین کے انتخاب میں بھی ایک آزادی کی روح کام کرتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔اس موقع پر ہمیں اِس تحریک کا ذکر کرنا پڑتا ہے جو کچھہ سال پہلے سے چلی آرہی تھی اور جس نے علمی افراد کے درمیان ایک طرح کی جنگ پیدا کردی تھی۔ہماری مراد اُس نئے مذہب ادبیات سے ہے جو دفعتاً ”عود شاہنشاہی“ کے پہلے سال میں نمودار ہوا اور جسے قدیم مذہب

ادبیات سے ممتاز کرنے کی غرض سے " رومانیت " کے نام سے یاد کیا جاتا ھے اور پرانے قواعد و ضوابط کے پیرووں کو قدیم یا کلاسک مذھب ادبیات کا نام دیا گیا ھے۔اس میں شک نہیں کہ انگریزی ادبیات نے جو کچھہ اثر فرانسیسی دماغ پر کیا وھی آگے چل کر اس تحریک کا سبب ھوا۔ " شاتوبرایاں " اور " مادام استیل " کی تصانیف نے اس اثر کو اور تقویت دی اور دراصل یہی دونوں اس مذھب کے امام اول کہے جاسکتے ھیں۔ " مادام استیل " ھی نے سب سے پہلے لفظ رومانیت استعمال کیا۔برق و رعد کا شور تو سنہ ۱۸۲۰ ع ھی سے سنائی دے رھا تھا۔لیکن سنہ ۱۸۲۴ ع میں یہ طوفان اپنی انتہائی شدت کے ساتھہ اُٹھا۔اس ادبی جنگ کا خاص سبب " آگر " معتمد مجلس علمی کی ایک تقریر تھی۔جس میں بھری مجلس میں اس نئی تحریک کو ھدف ملامت بنایا گیا تھا اور رومانیوں (Romanticists) کو " ادبی بدعتیوں " کا لقب دیا گیا تھا۔ " آگر " کا حصہ اس ادبی پیکار میں بہت کچھہ پر جوش رھا ھے۔

مجلس علمی نے بحیثیت جماعت ان مناقشات میں کوئی حصہ نہ لیا۔کیوں کہ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ھے بغیر مصنف کی خواھش کے کسی تصنیف پر تنقید و تبصرہ کرنا قواعد مجلس کے منافی تھا۔علاوہ ازیں مجلس نے اس معاملہ میں غیر جانبدارانہ روش کو پسند کیا اور اس خوف سے کہ کہیں اُس کے وقار اور شان میں کوئی خلل نہ واقع ھو اِس جھگڑے " سے الگ تھلگ رھی اور یہ ایک عجیب بات ھے کہ کچھہ اسی مرتبہ نہیں بلکہ ھمیشہ یہ مجلس قدیم روایات کی دلدادہ رھی ھے اور ھر نئی تحریک کو خاص کر اُس کے آغاز کے وقت مشتبہ نظروں سے دیکھتی رھی ھے۔ھاں تو اگرچہ مجلس علمی نے اجتماعی طور پر اپنا دامن بچائے رکھا لیکن انفرادی طور پر اُس کے اراکین علی‌الاعلان میدان کار زار میں اُتر آئے اور اس نئی تحریک کے شدید ترین مخالف اکثر اراکین مجلس ھی تھے۔لیکن رفتہ رفتہ مجلس میں وسعت نظر پیدا ھونے لگی۔

"شاتوبرایاں" تو بہت پہلے سے رکن تھا- سنہ ۱۸۲۵ ع میں "کاسی مردی لادین" بھی منتخب ہوگیا اور سنہ ۱۸۲۸ ع میں "ایم لبرون" بھی رکن بنا لیا گیا اور اگر "بریں جر" نے مقابلہ سے انکار نہ کیا ہوتا تو وہ بھی ضرور ہی منتخب ہو جاتا-

———:o:———

اپریل سنہ ۱۸۳۰ ع میں "یم-دی-لامارتین" کا انتخاب عمل میں آیا-یہ ایک اہم واقعہ تھا کیوں کہ اِس نے ثابت کردیا کہ خواہ ظاہری طور پر نہ سہی لیکن باطناً مجلس علمی بھی اس جدید مذہب کے لائق اور باکمال افراد کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتی ہے-جیسا کہ خود "لامارتین" نے اپنی تقریر میں کہا "اس انتخاب سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ مجلس مشاہیر عصر میں سے کسی کو بھی رکنیت سے محروم رکھنا نہیں چاہتی" اور یہ کہ اُس کے دروازہ بلا قید مذہب تمام اہل علم کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے-کچھہ عرصہ کے بعد "وکٹر ہیوگو" بھی رکن بنا لیا گیا-حالانکہ کچھہ دنوں پہلے اُس کے ڈراما "ھرنانی" پر ھرطرف سے شدید مباحثے و مناظرے ہوتے رہے تھے-پرانے نظام سلطنت کے بگڑ جانے کے بعد سے سرپرست کے عہدہ کی کچھہ زیادہ قدر نہ رہی تھی لیکن اور حیثیتوں سے آج کی مجلس علمی ویسی ہی ہے جیسی کہ "ری شی لیو" نے قایم کی تھی اور جو کہ لوئی چہاردھم کے زمانہ میں معراج کمال پر پہونچ گئی تھی-حسب دستور اسکے اجلاس پورے سال بھر ہفتہ میں ایک مرتبہ ہوتے ہیں-کیونکہ یہ مجلس کسی قسم کی کوئی تعطیل نہیں مناتی-تقسیم انعامات کے زمانہ میں ہفتہ میں دومرتبہ اجلاس ہوتا ہے-جس مجلس کی ابتدا اتنی حقیر تھی اور جس کے اراکین غریب اور معمولی حیثیت کے اہل علم تھے وہی مجلس آج نہ صرف ایک زبردست علمی جماعت ہے بلکہ ساتھہ ہی ساتھہ بہت کچھہ دولت مند اور باثر بھی ہے-اکثر لوگوں نے اس کے نام گرانقدر عطیہ

چھوڑے ھیں۔اس میں بہت کچھہ انعامات بھی تقسیم کئے جاتے ھیں اور ان کی
ھرشخص کو آرزو رھا کرتي ھے۔ ھرفرانسیسی اھل علم اسکے مشہور گنبد * کے
نیچے جگہ پانے کو علمی شہرت کی معراج تصور کرتا ھے۔

---:o:---

آغاز قیام مجلس سے لے کر موجودہ زمانہ تک اس کی تاریخ دیکھہ لینے
کے بعد اب ھم کس نتیجہ پر پہونچتے ھیں ؟ کیا اس کے منشاء قیام کی تکمیل
ھوچکی ھے ؟ کیا آج بھی یہ اُسی شہرت کی حقدار ھے جو اسے قدیم زمانہ میں حاصل
تھی ؟ کیا اُس نے کچھہ مفید خدمات انجام دیں اور اب بھی دے سکتی ھے ؟
مخالفین کے حملوں کے باوجود ھمارا خیال ھے کہ ان سب سوالات کا جواب
اثبات میں دیا جا سکتا ھے۔ ھم دیکھہ ھی چکے ھیں کہ اِس انجمن کے قیام کے بعد
ھی سے فرانسیسي زبان نے ترقی شروع کی اور رفتہ رفتہ وضاحت معانی۔
آب وتاب۔ صحت اور فصاحت کے اعتبار سے نیز سلاست کے ساتھہ اظہار خیال پر
قادر ھونے کی حیثیت سے اس زبان کا شمار بہترین السنۂ جدیدہ میں ھونے
لگا اور آج بھي ھوتا ھے۔

ھم یہ بھی دیکھہ چکے ھیں کہ اسی مجلس علمی کی بدولت ادبیات اور
ادیبوں کو جو پہلے کس مپرسی کی حالت میں پڑے ھوئے تھے۔ بلند ترین رتبے
اورعزتیں حاصل ھوئیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اسی کے اثر سے ملک کے اعلی
طبقوں میں علم کی وقعت اور محبت پیدا ھوئی۔اس کے علاوہ اس مجلس نے ان لوگوں
کی سرپرستی اور مدد کی جن کی ذھانت پردۂ گمنامی میں چھپی ھوئی تھی
اور جو اُس کی دستگیری کے بغیر یا تو عمر بھر بے دست و پا رھتے یا پھر

---

* سنہ ۱۸۰۸ع سے مجلس علمی کے جلسے قدیم قصر مازارین میں ھوتے ھیں۔یہ
مشہور گنبد اسی قصر کے اوپر ھے۔

ناچار خدایان سلطنت کے دروں کی خاک اُڑاتے اور اُن سے مدد کے طالب ہوتے —

———:o:———

لیکن ان سب باتوں کے باوجود مخالفین کے اکثر حملوں کو حق بجانب ماننا پڑتا ھے - وقتاً فوقتاً اس مجلس میں بے جا اعتراض اور تنقیص کی روح موجود رھی ھے جس نے بجاے زبان کو ترقی دینے کے بعض صورتوں میں اُسے سرمایۂ علمی سے محروم رکھا ھے - یہ مجلس پسندیدہ سے پسندیدہ اختراع اور ایجاد سے خائف رھی ھے گویا کہ اس کی علمی شان اور بزرگی کو اُسے تسلیم کرنے سے کسی قسم کا ضرر پہونچتا - اس کا بھی اقرار کرنا پڑتا ھے کہ اس نے بادشاھوں اور وزیروں کے سامنے بھی بعض اوقات سر اطاعت خم کیا ھے اور اکثر صورتوں میں یہ اطاعت غلامی کی حد تک پہونچ گئی ھے - اس کا بھی ھم دعوی نہیں کرسکتے کہ اُس کے انتخابات میں ھمیشہ حق و قابلیت کا خیال رکھا گیا ھے - ایسی مثالیں بھی نظر آتی ھیں جن میں مستحق افراد کو رکنیت سے محروم رکھا گیا ھے - کبھی کبھی راے دینے میں خانگی سازشیں اور سیاسی مصلحتیں علمی استحقاق و استعداد پر غالب آئی ھیں - لیکن اِن سب اور ان سے بھی زیادہ اعتراضات کو بھی اگر تسلیم کرلو تو بھی اچھائیوں کا پلہ برائیوں کے مقابلہ میں بھاری نظر آتا ھے اور ایسا ھونا ممکن ھی نہیں بلکہ ضروری بھی ھے کیوں کہ اس مجلس کی ڈھائی سو سالہ زندگی میں فرانس کے اعلیٰ ترین دماغ اس میں جگہ پاتے رھے ھیں - ایسے ایسے خداداد ذکاوت اور جودت رکھنے والے افراد اس کے رکن ھوئے ھیں جن کا پایہ تقریباً علم کے ھر شعبہ میں نہایت بلند تھا - جس مجلس کے ایسے اعضاء اور ارکان ھوں وہ لازمی طور پر اعلیٰ درجہ کی ھوگی - چنانچہ یہ مجلس بھی حقیقی معنوں میں اعلیٰ ھے - اُس کے افراد نرے ذکی اور ذھین ھی نہ تھے بلکہ وہ دیانت دار - مخلص اور عالی ظرف بھی تھے - وہ جری بھی تھے

اور اپنی جرات کا اِستعمال مجلس کی آذادی کی حمایت میں کرتے رہے- یہی سب باتیں ہیں جنھوں نے مل جلکر اس مجلس کو اعلیٰ بنادیا ہے- مجلس علمی کے جدید ترین مورخ فابرے کے بقول " فرانسیسی مجلس علمی نے بہت سے طوفانوں کے تھپیڑے سہے ہیں اور بہت سے انقلابات اور سیاسی اُتار چڑھاؤ سے بچ بچ کر نکلتی رہی ہے اور ہم کو پوری اُمید بلکہ یقین ہے کہ جب تک فرانسیسی قوم زندہ ہے یہ مجلس بھی زندہ اور قائم رہے گی "-

:o:

یکم مئی سنہ ۱۸۹۰ع کی تاریخ اس لئے مقرر کی گئی تھی کہ ایم- ایمیلی آژیر مشہور ڈراما نویس کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اُس پر کسی نئے رکن کا انتخاب عمل میں آئے- مازارین کے گنبد کے نیچے جگہ حاصل کرنے کے لئے اتنی سخت جنگ شاید پہلے کبھی نہ ہوئی ہوگی اور شاید پہلے کسی خالی جگہ کے لئے اتنے اُمید وار میدان میں نہ اُترے ہوں گے- تیرہ افراد ایک جگہ کے لئے مقابلہ کر رہے تھے !-

اب وہ زمانہ تو رہا نہیں کہ ری شی لیو کی مرضی یا کسی بادشاہ وقت کا حکم مجلس کے انتخابات پر اثر ڈال سکے- اب تو صدر جمہوریت کسی طرح کا دخل نہیں دیتا- ہاں سیاسی وجہ یا اور دوسرے اسی قسم کے اسباب اب بھی اراکین مجلس میں تفرقہ ڈال دیا کرتے ہیں- داد ے کا مشہور افسانہ " غیر فانی " کہیں کہیں سے پردہ ہٹاکر ہمیں پس پردہ حالات کی ذرا سی جھلک دکھا دیتا ہے اور اگرچہ اس قصہ میں کسی قدر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے پھر بھی اتنا یقینی ہے کہ ہر انتخاب کے موقع پر سازشوں کی گرم بازاری ہوتی ہے اور رایوں پر بہت سے اثرات ڈالے جاتے ہیں- جس یکم مئی کا ہم نے ذکر کیا اُس دن یہ بات خاص طور پر دیکھنے میں آتی تھی- میدان مقابلہ خوب گرم تھا اور عرصہ تک گرم رہا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا- انتخاب کے لئے ضروری تھا

کہ کم از کم بیس رائیں (یعنی نصف مجلس سے ایک زیادہ) حاصل کی جائیں اور کسی ایک امیدوار کو بھی اتنی رائیں نہ مل سکیں —

چونکہ جنگ کی شدت کا اندازہ پہلے ھی سے سب کو تھا اس لئے جملہ اراکین اپنی اپنی جگہ پر موجود تھے - اُنتالیس " غیر فانیوں " میں سے صرف ایک یعنی ڈیوک آمیل موجود نہ تھا کیوں کہ وہ اُس وقت سسلي میں تھا - ایم ری نین بھی لوگوں کے کندھوں پر سوار ھوکر اپنی رائے دینے آگئے تھے - حالانکہ شدید وجع مفاصل میں گرفتار تھے - لیکن غیر حاضر رھنا انہیں کس طرح گوارہ ھوسکتا تھا - ٹھیک ایک بجے جلسہ کی کارروائی شروع ھوئی - سب سے پہلے معتمد مجلس علمی نے وہ خط پڑھکر حاضرین کو سنائے جو تیرہ اُمیدوارں نے مجلس کے نام لکھے تھے - پھر قدیم دستور کے موافق حاضرین کو ھدایت کی گئی کہ جملہ رائیں " کامل آزادی اور بغیر کسی جبر و اکراہ کے " دی جائیں - رائیں لی گئیں - سات مرتبہ رائیں لی گئیں - لیکن نتیجہ ھمیشہ وھی رھا یا یوں کہو کہ کچھہ نہ رھا - کیوں کہ کسی مرتبہ بھی کسی اُمیدوار کو دس سے زیادہ رائیں نہ مل سکیں - - ساتویں مرتبہ رائے طلب کرلینے کے بعد جب ناظم مجلس نے دیکھا کہ جلسہ کو مزید طول دینا فضول ھے تو اُس نے تجویز کی کہ انتخابات کی تاریخ بڑھادی جائے اور یہ تجویز بالاتفاق رائے منظور ھوئی —

———:o:———

امیدواران رکنیت میں تنوع کی کوئی کمی نہ تھی - مقابلہ کرنے والوں میں صرف مورخ اور ادبی نقاد ھی شامل نہ تھے - بلکہ افسانہ نگار شعرا - سائنس داں - ڈرامانویس سب ھی تھے - بعض زبردست استعداد رکھتے تھے - بعضوں کا مبلغ علم معمولی تھا - کچھہ ایسے بھی حضرات تھے جن کے نام سے خود فرانس میں بھی زیادہ لوگ واقف نہ تھے - مشہور اُمیدواروں میں ایم زولا بھی تھا - اکثر لوگوں کو تعجب بھی ھوا کہ اُس نے " غیر فانیوں " میں شامل ھونے

کا خواب کس طرح دیکھ لیا ! اُس کی تصانیف کے حسن و قبح سے تو ہم کو کچھ زیادہ سروکار نہیں ہے ہاں اتنی بات مسلمہ ہے کہ اُن میں سے کوئی بھی تو ایسی نہیں ہے جو علمی کہی جا سکے !—

اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ اُس کی آخری تصنیف سے پہلے کی کتاب یعنی Le Reve " خواب " مجلس علمی کے اعزازات حاصل کرنے کے خیال سے لکھی گئی ہے۔ جو کچھ بھی ہو اتنا ضرور ہے کہ اس کی مذکورۂ بالا تصنیف اور دوسری تصانیف کے درمیان وہی فرق ہے جو دن رات۔ نور اور ظلمت میں ہوتا ہے۔ ایک موقع پر جب ایم زولا کے کسی دوست نے اُس سے دریافت کیا " کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو کوئی موقع ہے ؟ " تو اُس نے جواب دیا " یہ تو میں جانتا ہوں کہ مجھے اس مرتبہ کسی قسم کا موقع نہیں ہے۔ لیکن میں نے مستقل رہنے کی نیت کر لی ہے اور آخیر میں مجھے کامیابی کی اُمید بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر شخص کو خاص کر ہر صاحب فن کو اُن تمام ممکنہ اعزازات کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جن کا وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتا ہو۔ ہم سب کے لئے مجلس علمی میں جگہ پانا اعلیٰ ترین ادبی اعزاز ہے اور میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اُس کے لئے ضرور کوشش کروں گا " —

:o:

انہیں امیدواروں میں ایک اور افسانہ نگار پیری لوتی بھی تھا۔ اس کی تصنیفات میں ہمدردی کا رنگ بہت گہرا جھلکتا ہے۔ وہ ایک قدیم ہیوجی ناٹ خاندان کا رکن ہے۔ جس نے کئی صدی قبل جزیرۂ اوبی ران میں پناہ لی تھی۔ ہم اُسے " بحری شاعر " کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ باعتبار عہدہ وہ ایک بحری افسر ہے * —

---

* ابھی حال ہی میں پیری لوتی کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس مصنف کو ترکوں سے

(باقی صفحہ آئندہ)

اجنبی سرزمینوں اور دور دراز سمندروں سے۔ہر اُس جگہ سے جہاں اُس کی بحری زندگی کے انقلابات اور اتفاقات اُسے لے گئے ہیں وہ سوغات کے طور پر ایسی یاد اور ایسے ایسے بیانات محفوظ کرکے لایا ہے جو اپنے اچھوتے پن اور اپنی دکھ بھری رقت کی وجہ سے بہت دلکش ہیں۔اُس کی تازہ ترین تصنیف "Le Roman en Enfant" (ایک بچہ کا افسانہ) میں ہمیں پرانے ہیوجی نات خاندانوں کے مرقع نظر آتے ہیں جو ہوبہو سترھویں صدی کے کسی انگریز خاندان کی تصویریں معلوم ہوتی ہیں۔انجیل کا پرانا خاندانی نسخہ جسکو چھوٹے بڑے سب بہت احترام کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔فرشتہ صورت وادی جو سخت گیر بھی ہے اور رحمدل بھی اور ایسی ہی دوسری چیزوں کا بیان کمال رقت اور لطافت کے ساتھہ کیا گیا ہے۔ایک نہ ایک دن لوتی ضرور چالیس کے مجمع میں نظر آئے گا لیکن اس مرتبہ نہیں!—

———:•:———

ایک اور اُمیدوار ایم برونی تی یر تھے۔یہ ایک زبردست نقاد ہیں۔ رسالہ Revue dex deux Mondes میں ان کے مضامین اکثر چھپتے رہتے ہیں اور بہت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔لیکن جو دو اُمیدوار رکنیت کے لئے سخت مقابلہ کر رہے تھے وہ ایم لادیسی اور ایم تھیورو دانگن تھے۔یہ دونوں کے دونوں اعلیٰ پایہ کے مورخ ہیں۔اول الذکر سوربون میں تاریخ کے پروفیسر ہیں اور تاریخی مباحث پر قابلیت کے ساتھہ قلم اُٹھاتے ہیں۔اِس کے علاوہ انہیں با اثر دوستوں کی حمایت بھی حاصل ہے۔جنھوں نے کہ ان کی کامیابی کے لئے

بہت منحبت تھی اور اکثر اپنی ناولوں میں اس نے اُن کی معاشرت کی تصویریں دکھائی ہیں۔اس کی کچھہ ناولوں کا ترجمہ فارسی میں بھی ہوچکا ہے "پریرو بہان ناکام" ایسا ہی ترجمہ ہے۔اس کی دوسری ناولیں یہ ہیں - Le Marriage de Loti;
Mon Frere Ives; Propos d' Exil; Madame Chrisantheme.

کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ہے - لیکن تھیورودانگن کے حقوق ایم لادیسی سے نہیں بڑھے ہوئے ہیں - کئی سال سے اُنکی حیثیت ہونیوالے رکن مجلس کی سی تسلیم کی جاتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اُن کی علمی خدمات اُنہیں ہر طرح سے اس اعزاز کا اہل بناتی ہیں - " ماہ جولائی کی شہنشاہیت کی تاریخ " اُن کی خاص تصنیف ہے اور اُنہیں ممتاز مورخوں کی صف میں شامل کر دیتی ہے - صرف فصاحت اور زبان کی دلکشی ہی اس تصنیف کی خوبیاں نہیں ہیں بلکہ دیانت - غیر جانبدارانہ نظر اجتہاد و آزادی آرا بھی اس کی نمایاں خصوصیتیں ہیں —

———:o:———

مذکورۂ بالا اُمیدواروں کے علاوہ عین انتخاب کے وقت رکنیت کے ایک اور اُمیدوار پیدا ہوگئے - یعنی ایم دی فرے سینے وزیر اعظم و وزیر جنگ فرانس ! اُن کی کامیابی شروع ہی سے یقینی سی ہوگئی - کیونکہ ادبی قابلیت کے علاوہ خود اُن کے عہدہ کا اثر کتنا بڑا تھا - مختصر یہ کہ گیارہ دسمبر کو دوبارہ انتخاب ہوا اور ایم فرے سینے کو رایوں کی مقررہ تعداد مل گئی یعنی نصف سے ایک زیادہ - حاضرالوقت اراکین کی تعداد ۳۸ تھی اور اُن میں سے ۲۰ نے اُن کے موافق رائیں دیں - ہم اتنا اور بتلائے دیتے ہیں کہ ایم فرے سینے کا " توشۂ علمی " * نہ تو بہت بھاری ہے اور نہ کچھ زیادہ اہم - کچھ رسالے علمی مباحث پر ہیں اور شاید ایک کتاب ہے جو سنہ ۱۸۷۰ع کی جنگ کے بعد لکھی گئی تھی - اس آخرالذکر تصنیف کی بہت کچھ تعریف کی جاتی ہے - کم از کم اُن کی جماعت کا یہ خیال ہے کہ ایم - فرے سینے کچھ ملکی اور عام خدمات کی بجاآوری کے بھی دعویدار ہوسکتے ہیں - مجلس علمی کے دروازے ہمیشہ

* اُمیدواروں کی تصانیف اور دیگر علمی خدمات - اسناد و مہرہ کو مجموعی طور پر اُن کا Literary Bagol کہا جاتا ہے —

خدمت عامہ کرنے والوں کے لئے کھلے رہے ہیں-خواہ یہ خدمت قلم کے ذریعہ سے کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو—

—————§•§—————
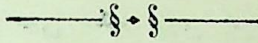
مجلس علمی کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اُس کا افتتاح مناسب ساعت میں کیا گیا-اُس نے کسی حدتک فرانسیسی زبان کو معین کردیاھے اور ادبیات پربھی اُس کااثر کچھہ معمولی نہیں ہے-مرور زمانہ اور روایات نے فرانسیسی ادیبوں کے لئے اس کی رکنیت کوایک قابل آرزوچیزبنادیاھے- لیکن اس رکنیت سے عملی فائدہ اسی وقت ہوسکتاھے جبکہ مقبولیت اور عام راے بھی اس کی شریک ہو-انگریزی ادب بجا طور پر یہ فخر کرسکتاھے کہ اگر کوئی بڑی سے بڑی مجلس علمی بھی قایم کي جائے توبھی اُس میں ان انگریزی ادیبوں کی سمائی نہیں ہوسکتی جوبجاطورپر رکنیت کے مستحق ہیں-انگریز مصنفین بغیر غور وتامل کے اپنے آزادانہ شریف اور ہمہ‌گیر پیشہ کو کسی ایسی مجلس کا پابند نہیں بناسکتے جس کا مقصد حیات صرف ”جکڑبندی“ اور تحدید ہو اور اگرایسی مجلس قائم بھی ہوجائے تب بھی ہماراموجودہ ادب جس حالت میں ہے اُس کے اعتبار سے ایسی مجلس صرف خارجی وقار اور ظاہری عزت کاذریعہ ہوسکتی ہے اور بس—

جیت کی کنجی

از

(جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب)

ہے ایک پہیلی اپنا جینا ایک معمہ مر جانا
اک راز یہاں کا آنا جانا
خون جگر پینا بوجھنا اس کا مفت کا گویا غم کھانا
آخر یہی جانا کچھہ نہیں جانا

—☽(•)☾—

زیست کے معنے ہیں درد کا سہنا سکھہ کا اُٹھانا مردانا
ڈر کا کچل دینا ڈر کا مٹانا
جان ہتیلی پر رکھنا جینا ہارنا جی کا مر جانا
جان کا کھو دینا جان کا پانا

—☽(•)☾—

سکھہ کا منشا ہے بس اتنا ہی سکھہ کام کی ہے تیاری
سکھہ سے تازہ دم کام کے قابل
دن بھر کام کا پھل رات کی نیندیں نیند کا ثمرہ بیداری
سکھہ یا دکھہ یکساں سم قاتل

—☽(•)☾—

دکھ اک سکھشا ہے بن دکھ جان کو آرام نہیں چین نہیں
سکھ خواب ہے گویا دکھ بیداری
ہر کام میں دکھ ہے دکھ میں سکھ ہے گو کام نہیں چین نہیں
ہے کام کی جگ میں برکت ساری

کام عبارت ہے سوگرمی سے کام دساغی بجلی ہے
اس زور سے ہر مشکل ٹلتی ہے
سارے زوروں کا زور یہی ہے یہی جیت کی کنجی ہے
کام سے دنیا آگے چلتی ہے
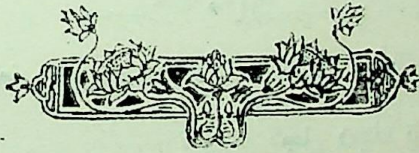
ادبیات ایران در زبان مشروطه

(ذیل کا مضمون ایران کے مشہور اہل قلم رشید یاسمی کا لکھا ہوا ہے۔ رشید ایک روشن خیال پرجوش نوجوان ہیں اور ایرانی ادبیات میں ان کی حیثیت متجدد کی سی ہے۔ آپ کو قدماے ایران کے ساتھ بھی بہت محبت ہے۔ آپ صاحب تالیفات بھی ہیں جن میں تذکرہ ابن یمین خاص طورپر قابل ذکرہے۔ آپ کی فارسی نثر ایک مخصوص انداز رکھتی ہے۔ رشید شاعر بھی ہیں اور اُنکی نظمیں ایرانی ادبیات میں وہی درجہ رکھتی ہیں جواقبال کا اُردو نظم میں ہے۔ ہم آقا میرزا محمد تقی صاحب علمی شیرازی پروفیسر اورنگ آباد کالج کے ممنون ہیں جنھوں نے اپنی عنایت سے یہ مضمون رسالہ اُردو کے لئے لکھوایا۔ ترجمہ کے مقابل اصل فارسی تحریر بھی درج کردی گئی ہے تاکہ زمانۂ حال کے ایک نامور ایرانی ادیب کی انشاپردازی کا نمونہ معلوم ہوجائے—

مولوی سید وھاج الدین صاحب پروفیسر اورنگ آباد کالج نے ازراہ عنایت اس کا ترجمہ اُردو میں کرکے دیاہے—

(اڈیٹر)

امروز عهد تحول زبان فارسی هست ایرانیان پس از آشنائی به ادبیات اروپائی احتیاج به یک تجدد

آج وہ زمانہ ہے کہ فارسی زبان اپنا چولا بدل رہی ہے۔ یورپی ادبیات سے واقف ہوکر اب ایرانیوں نے بھی

کاملے را احساس نمودند- شخص تا
محصور عادات و رسوم خود هست
هیچ نمی تواند عیوب انها را فهمیده
و در رفع نواقص خود کوشش نماید-

اروپا هر چند بطور خیلے ناقص
ولے بازتا درجۂ قابل توجهی بایرانے
فهمایند که غیر از کلمه بازی نوعے
دیگر هم از چیز نویسی وجود دارد
و قبل از رعایت الفاظ که قالب هاے
بے روح هستند توجه بمعانی باید
منظور نویسنده باشد ادبیات قدیم
ایران برایں خط سیر نموده و ایرانے
در حالتے که تجدد میکرد و ظاهرا
اروپا را سر مشق خود قرار میداد
اصولاً پیروی از بزرگان قدیم خود کرده
و بر طریقه انها سلوک می نمود
فاصله چهار صد سال که میان آن عهد
و این دوره واقع بود البته بسهولت
طے نمی گشت ادبیات صفوی و زند
و قاچار بآسانی فراموش نمی شد
ناچار میان فکر جدید خواهی و عادت
قدیم پرستی یک جدال تسکین
ناپذیرے دوام یافت—

یہ محسوس کرلیا ھے کہ اُن کی ادبیات
میں پوری طرح تبدیلی ھونا چاھئے-
آدمی جب تک اپنی عادتوں اور
رسموں میں پھنسا رھتا ھے اِن چیزوں
کی برائیاں نہیں سمجھہ سکتا اور
نہ اپنی خامیوں کے دور کرنے کی کوشش
کرسکتا ھے—

یورپ نے خواہ اُس کا طریقہ کتنا
ھی ناقص کیوں نہ کہا جائے لیکن
پھر بھی بہت کچھہ قابل توجہ پیرایہ
میں ایرانیوں کو یہ بات سمجھائی کہ
انشاپردازی سے مراد صرف کلمہ
بازی اور لفاظی ھی نہیں- بلکہ کچھہ
اور بھی ھے- نیز یہ کہ الفاظ کی رعایت
سے پہلے (جن کی حیثیت محض قالب
بے روح کی سی ھے) لکھنے والے کو
معانی پر توجہ کرنی چاھئے- ایران
کی قدیم ادبیات اسی راستہ پرگئی
تھی اور خود ایران جدید بھی اگرچہ
جدت پسندی پر آمادہ تھا اور بظاھر
یورپ کے نقش قدم پر چل رھا تھا
لیکن اصولاً اپنے پرانے بزرگوں کی
پیروی کرتا تھا اور اُنھیں کی دکھلائی

یک دسته از نویسندگان در آثار
خود قید سجع و مراعات النظیر و سایر
قیود را درهم شکستند نویسندگی
عبارت شد از بیان معانی و توجه
بالفاظ و زینت جمله متروک ماند
یعنی نویسنده اول فکر می کرد چه می
خواهد بنویسد بعد کلماتے برای بیان
آنها استخدام می نمود و این بر خلاف
رویه سابقین بود —

عیب بزرگے که درین تجدد پیدا
شد این بود که مثل همیشه و همه جا
زمام نویسندگی بدست جوانان افتاد
که متاسفانه و طبیعاً از معلومات
گذشته و نگارش پیشین چندان اطلاع
نداشتند فضلا و ادبائے که در ادب
ماضی دست داشتند پس یک مقاومت
مایوسانه مغلوب شدند و گوشه گرفته
و با چشمے منتقد و ناراضی بقلم
جوانان نگران شدند طبقهٔ جوان هم که
یکباره بر ادب گزشتگان پشت پا زده
و بر خود حتم کرده بود که لفاظی را
مهمل گزاشته و معانی را بآسانی‌ترین
عبارتے بیان کند دو چار دو مشکل شد

ہوئی شاہراہ پرگام زن تھا۔ قدیم و
جدید عہد کے درمیان جو چار سو سال
کا فاصلہ حائل تھا وہ آسانی سے کیونکر
طے ہوسکتا تھا۔ صفوی۔ زند اور قاچار
کے عہدوں کی ادبیات کو بھول جانا
آسان نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جدت
پسندی کے رجحان اور قدامت پرستی
کی عادت کے درمیان ایک ابدی
جنگ چھڑ گئی —

—:o:—

انشاپردازوں کا ایک ایسا گروہ
وجود میں آیا جس نے اپنی تصنیفات
سے سجع مراعات النظیر اور تمام
پابندیوں کو نکال پھینکا۔ انشاپردازی
بیان معانی کی مرادف قرار پائی
اور الفاظ پر توجہ کرنا اور جملوں
کو سنوارنا متروک ہوگیا۔ لکھنے والے
پہلے یہ سوچتے کہ کیا لکھا جائے اور
پھر اُسے بیان کرنے کے لئے کلمے ڈھالے
جاتے اور یہ طریقہ قدیم روش کے
خلاف تھا —

اس دور تکون میں جو سب سے
بڑا عیب پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ہر

طریقه فرمولی نظم و نثر قدیم که
زیبائے ظاهر داشت از و پوشیده ماند
و برائے پوشاندن معانی بفقر مبرمی
مبتلا گشت و معانی نیز که مطمح نظر
بود متاسفانه بیک خواهش عاشقانه
نصیب او نمی شد محتاج بسعی و صبر
و صرف عمر بسیار بود و بدیهی است
که این سه عامل کمتر در دسترس
جوان می آید —

اروپائے که او را مفتون میکرد
فقط یک آئینه بود که اشعهٔ خورشید
علم را بطور مبهم و خیره کننده بچشم
او میفرستاد و حقائق را در حجاب
نور شدید از نظر او مخفی میداشت۔

جوان نه گزشته را لایق پیروی
می دانست و نه ازاردپا می توانست
چنانکه باید معانی و علوم اخذ
نماید وقتیے که رشتهٔ الفاظ گسیخته
شد و فکر نویسنده را نه سنجع مدد
کرد و نه معانی راهنماے نمود معلوم
هست چه اغتشاشی رخ خواهد داد
دیگر نه معانی فارسی ماخوذ از اروپا
لفظ متناسبے پیدا کردند و نه الفاظ

زمانے اور ہر جگہہ کی طرح ایران
میں بھی تصنیف و تالیف کی باگ
جوانوں کے ہاتھوں میں آگئی جو
قدرتی طور پر معلومات گزشتہ اور
زمانہ سابق کی تحریروں سے کچھہ
زیادہ با خبر نہ تھے۔وہ فاضل اور
ادیب بزرگ جن کو قدیم ادب میں
دسترس حاصل تھی مایوسانہ مقابلہ
کے بعد ہار مان گئے اور اس میدان
سے الگ ہٹ کر غصے اور عیب جوئی
کی نگاہوں سے نوجوانوں کے قلم کو
دیکھنے لگے۔اِس طبقہ کو جس نے
دفعتاً ادبیات قدیم کو ٹھکرا دیا تھا
اور لفاظی کو مہمل سمجھنے اور
مطالب کو آسان ترین عبارت میں
بیان کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا دو
دقتوں کا سامنا کرنا پڑا:—

ایک طرف تو قدیم نظم و نثر
کا ڈھلا ڈھلایا طریقہ جو ظاہری
زیبائش رکھتا تھا اُن کی نظروں سے
چھپ گیا اور وہ اپنے مطالب کے ابلاس
کے بارہ میں زبردستی فقیر بن کر
رہ گئے اور دوسری طرف افسوس ہے

به تسلسل طبیعی و عادی خود عود
نمودند چه بسا افکار تازه و بدیع که
از نارسائی الفاظ مستور ماندند!
و چه بسا الفاظ زیبا که بعلت تزلزل
معانی بی تاثیر شدند! ادبیات ایران
بیک خرمن کوبیده شبیه گشت که
دانه ها را یک مرض بناتی بیمغز کرده
باشد بقسمی که هر چند در ظاهر
هیکل خرمن اُمید بخش و چشم پر کن
باشد پس از باد دادن و جدا کردن
کاه هیچ چیز مثبت و مفیدی بدست
دهقان نمی رسد—

متجددین با تعجب و تاسف برین
پیش آمد نگاه می کردند و با وسایلی
که بی مطالعه بعمل گزاشته می شد
ندا کارانه در تداوی این بیمار
مبادرت میورزیدند از استعمال الفاظ
اروپائی افراط کردند نه تنها ازین
جهت که از الفاظ مناسب زبان خویش
غفلت داشتند بلکه باین اُمید که در
الفاظ اروپائی یک اثر فوق العاده
موجود باشد انها می دیدند که همین
الفاظ در آن قطعه دنیا آثاری عجیب

که اُن کے حسب مقصد مطالب بھی
محض عاشقانه آرزو سے حاصل نه
ھو سکتے تھے۔ اُنھیں حاصل کرنے کے لئے
کوشش۔ صبر اور بڑی عمر صرف کرنے
کی ضرورت تھی اور ظاھر ھے که یه
تینوں عامل جوانوں کے قبضه میں بھت
کم ھوتے ھیں—

جس یورپ نے جوانوں کو رجھا
لیا تھا فقط ایک ایسا آئینه تھا جو
آفتاب علم کی شعاعوں کو مبھم اور
خیره کن بنا کر اُن کی آنکھوں پر
ڈالتا تھا اور جس نے تیز روشنی کا
پرده ڈال کر حقائق کو اُن کی نظروں
سے اوجھل کر دیا تھا—

نوجوان نه تو گزشته ادبیات
کو قابل پیروی سمجھتے تھے اور نه
جیسا که چاھئے یورپ ھی سے معانی
و علوم اخذ کر سکتے تھے۔ جب الفاظ کا
شیرازه بکھر جاتا ھے اور لکھنے والے
کی مدد کے لئے نه تو سجع ھی موجود
ھوتا ھے اور نه مطالب ھی اُس کی
ھدایت کرتے ھیں تو ظاھر ھے که کیا
کچھه میل اور آمیزش پیدا نھیں ھوتی

میکنند ولے معانی انہا در زبان فارسی
بے رنگ و بے اثر می ماںند پس ہمان
الفاظ را عین بکار بردند تا از تاثیر
ساحرانہ انہا ادبیات روحے بگیرد
لیکن علاوہ بر ضررے کہ ورود لغات
اجنبی بر زبان فارسی می رسانند
مسلم شد کہ در لفظ بے سابقہ و بے رابط
با تمام جملہ ہیچ اثرے نہ ساحرانہ
و نہ عادے موجود نیست و بنابر
قول قدما بہ تحقیق رسید کہ : ع :

"ہر چیزی بجاے خویش نیکوست"

——:0:——

ترجمہ شروع شد - ولے در یک
دائرہ تنگے کہ ازحدود قصہ
و ادبیات ابتدائی ملل اروپا تجاوز نمی
کرد یعنی حدے کہ الفاظ عادی و رائج
براے تعبیر و ترجمہ آن کفایت کند
و احتیاج بہ لغات و اصلاحات عالیہ
نیفتد —

این توجہ معتقدانہ باروپاے
سطحی و اعراض از گزشتہ ادبے
در ایران ہنوز دوام دارد فقط
یکدستہ درین سالہاے اخیر آشنائی

پھر نہ تو یورپ سے مستعار لئے ہوئے
فارسی مطالب اپنے مناسب الفاظ ھی
پیدا کرتے تھے اور نہ الفاظ اپنے فطری
اور بندھے ہوئے تسلسل کے ساتھہ
ذہن میں اُبھرتے تھے - کیسے کیسے
تازہ خیالات محض الفاظ کی نا رسائی
کی وجہ سے چھپے رہے ! اور کتنے ھی
خوبصورت الفاظ مطالب کے تزلزل کے
باعث بے تاثیر رہ گئے ! ایرانی ادبیات
کی حالت اُس خرمن کی سی ہو گئی
جس کے دانوں کو گھن لگ گیا ہو یعنی
جو بظاہر تو خرمن کی صورت رکھتا
ھے اور دیکھنے میں بھرا پرا معلوم
ہوتا ھے لیکن پھٹکنے کے بعد سواے
بھوسے کے کوئی مفید اور کام کی چیز
دہقان کے ہاتھہ نہیں لگتی —

جدت پسندوں نے اس نئی اُفتاد
کو تعجب اور افسوس کے ساتھہ دیکھا
اور اُن وسائل سے کام لیکر جن پر
بغیر غور و خوض کے عمل کر لیا گیا
تھا - تندہی کے ساتھہ اس بیمار کے علاج
کی کوشش کرنے لگے - اُنھوں نے یورپی
الفاظ کو کثرت سے استعمال کرنا شروع کیا

باروپا را بدرجه صمیمیت رسانیده
وبیش از سایرین باعماق آن فرو رفته
ودرهمان وقت بگزشته ایران نظرے
بے تنفر اندافتند وسعی کرده اند
حقایقے را که متجددین صدر
مشروطیت از شدت حرارت تجدد
خواهی نمی دیده اند کشف کرده
آشنائی قطع شده را بازبان خود
محکم سازند یعنی هم اروپا وهم
ایران قدیم را بانظر صرافانه بنگرند
از ظاهر زیبائے اروپا خیره نمی
شدند و از صورت پرچین ادبیات
ماضی مایوس ورمیده نگردند به
بینند حقیقت امر کجاست؟ برتری
ادبی اروپا گزشته از تجمل
درچیست ؟ و پستی ادب ایران
غیر از پیری و غیر از لباس ژنده
درجه ؟

این طبقه از متجددین کشف کردند
که ادبیات ایران این قدرها محکوم
و سزاوار منفوریت نیست - کتب قدیمه
فراموش شده بها نشان می دهند که پیش
از دورهٔ لفاظی این چهارصد سال

اُس کی وجه صرف یهی نه تهی که
وه خود اپنی زبان کے متناسب الفاظ
سے ناواقف تهے - بلکه اُنهیں یه اُمید
بهی تهی که یورپی الفاظ میں ضرور
کوئی غیر معمولی اثر موجود هوگا -
وه دیکهتے تهے که یهی الفاظ اُس
قطعهٔ دنیا (یورپ) میں عجیب اثر
رکهتے هیں لیکن فارسی زبان میں
آکر اُن کے معنی میں وه رنگ اور
اثر باقی نهیں رهتا - لهذا اُنهوں نے
وهی الفاظ استعمال کرنے شروع کردئیے
تاکه اُن کی ادبیات بهی اِن کے طلسمی
اثر سے جی اُٹهے - اِن اجنبی لغات کی
درآمد سے فارسی زبان کو جوضرر پهونچا
وه ظاهر هے - لیکن ساتهه هی اُن پر
یه حقیقت بهی آشکارا هوگئی که انوکهے
الفاظ میں جو پورے جملے کے ساتهه
کوئی ربطه نه رکهتے هوں کوئی طلسمی
یا طبعی تاثیر نهیں پائی جاتی - اب
انهیں قدما کے اس قول کی صداقت
معلوم هوئی که : ؏ : هر چیزی بجاے
خویش نیکوست ـــ

——:o:——

گزشتگان ما نظم و نثر طبیعی موثرے
داشته اند که امروز نیز باوجود
فراموش شدن سبک جمله بندی
وطرز اداے معانی هرکسے که اندک
وقوفے برادبیات قدیم بیابد
از خواندن آثار گزشتگان متاثر
شود —

این اشخاص فکرکردند که اثر
بخشی عمیق ترین خاصیت ادبیات
است وبرتری ادبیات مغرب زمین
از همین اثرے که در روح می کند
و از این نتیجه گرفته که یک رویه
مشترک میان قدماے ایران و اروپاے
این قرن موجود است و آن متابعت
از طبیعت و مطابقت با حقیقت است
هر گاه که یک روحے نظماً یا نثراً
سخن می گوید البته زبان او را روح
هاے دیگر می فهمند و متاثر می شوند
و بالعکس هر وقت زبانے بقوت لفاظی
و فریب ظاهر سازی بخواهد بیان
خود را کلام روح جلوه دهد ابداً در
ارواح شنوندگان و خوانندگان
اثرے نکرده و دروغش را فروغے

ترجمه شرع هوا لیکن اس کا
دائره بهت تنگ رها یه اقوام یورپ
کے افسانوں اور اُن کی ابتدائی
ادبیات کی حد سے آگے نه بڑھا-
یعنی اسی حد تک رها جهاں تک
که روز مره استعمال کے الفاظ تعبیر
و ترجمه کا ساتهه دیں اور اعلیٰ لغات
اور اصطلاحات کی ضرورت نه پڑے —
سطحی یورپ کی طرف یه عقیدت
مندانه توجه اور ادبیات قدیم کی
طرف سے بے اعتنائی ایران میں ابهی
تک باقی هے- صرف ایک گروه ایسا
هوا هے جس نے اِس اخیر زمانے میں
یورپ سے واقفیت پورے طور پر
حاصل کرلی هے- یه لوگ دوسروں
کے مقابله میں ادبیات یورپ کی تهه
میں بهت زیاده دور تک گئے هیں-
اس کے ساتهه هی ساتهه اُنهوں نے
ایران قدیم پر نفرت آمیز نظر
نهیں ڈالی هے- بلکه اُن حقائق کو
آشکارا کرنے کی کوشش کی هے جنهیں
درمیانی عهد مشروطه کے جدت پسند
اپنی جدت پسندی کے جوش میں دیکهه

نخواهد بود و باز یکبار دیگر قول
پیشینیان را تصدیق کردند که : ع :

" سخن کز دل بروں آید نشیند
لاجرم بر دل "—

—:o:—

چوں اروپا را بهتر شناخته بودند
یافتند که در آنجا هم هر نویسنده
صاحب نفوذ در روح خواننده
نمی شود و معدودے ازو هستند
که ترجمان کلام جانها هستند و میان
جانها رابطۂ گفتگو واقع می کردند
میان تفاوتے که تجدد خواهان اول
دیدند ادبیات ما و خارجیان تشخیص

ھی نہ سکے تھے اور اِس طرح سے اپنی
زبان کے ساتھه محبت کی جو رسم
ٹوٹ گئی تھی اسے پھر استوار کیا ھے
یه یورپ اور ایران قدیم دونوں
کو نقادانه نظروں سے پرکھتے ھیں اور
نه تو اُس کی ظاھری زیبائش سے اُن
کی آنکھیں خیرہ ھوتی ھیں اور نه
اِس کا جھریوں دار چہرہ دیکھه کر
اِس میں مایوسی اور وحشت پیدا
ھوتی ھے-یه لوگ صرف یه دیکھتے
ھیں که حقیقت امر کہاں پائی جاتی
ھے ؟ دھوم دھام سے قطع نظر کرکے
یورپی ادبیات کی فوقیت کس چیز
کی وجه سے ھے ؟ اور پیری اور لباس
کی کہنگی کو اگر خارج از بحث قرار
دے لیا جائے تو ادبیات ایران کی
پستی کی علت کیا رہ جاتی ھے ؟—

جدت پسندوں کے اس گروہ نے
یه بات دریافت کرلی که ایرانی
ادبیات اس قدر محکوم اور لائق
نفرت نہیں ھے-پرانی بھولی ھوئی
کتابوں سے پته ملتا ھے که اس چھار
صد ساله دور لفاظی سے قبل ھمارے

داده اند کاملاً مصنوعی بوده
و مزایائی که از اروپا دیده و معایبی
که در ادبیات ایران تمیز داده اند
سطحی و در درجۂ سوم و چهارم است

—:o:—

پس یکبار دیگر بایران عزیز خود
توجه کردند مانند غواصی که صیدگاه
ترک شده خود را بازیابد در دریا
فرو رفته اروپا و ایران قدیم عمقاً
عرصۂ غواصی آنها شد و وفق دادن
ادبیات این دو کشور منظور نظر
آنها گشت—

—:o:—

قدما فطری اور موثر نظم و نثر پر
حاوی تھے اور آج بھی اگرچہ جملوں
کی اطیف بندش اور ادائے معانی کے
طریقوں کو لوگ بھلا بیٹھے ھیں لیکن
اس کے باوجود ھر شخص جسے قدیم
ادبیات سے تھوڑا بہت بھی مس
ھو جاتا ھے آثار قدما کے مطالعہ سے
ضرور متاثر ھوتا ھے—

ان لوگوں نے یہ سمجھہ لیا کہ کسی
ادب کی انتہائی خاصیت یہ ھے کہ اُس
میں اثر بخشی پائی جائے اور سرزمین
مغرب کی ادبیات کی فوقیت کا سبب
اس کا یہی اثر ھے جو روح پر پڑتا ھے۔
اس سے ان لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ
قدمائے ایران اور دور حاضر کے یورپی
لوگوں میں ضرور ایک نہ ایک روش
مشترک موجود ھے اور وہ "پابندی
فطرت اور مطابقت حقیقت" ھے۔ جب
کبھی کسی روح کی آواز نظم یا
نثر کی صورت میں ظاھر ھوتی ھے
تو ضرور ھے کہ دوسری روحیں اُس
آواز کو سمجھیں اور اُس سے متاثر ھوں۔
برخلاف اس کے جب زبان یہ چاھتی ھے

اکنون تقلید کور کورانه اروپا
بواسطه کشف مزایاے ادبیات قدیم
ایران رو بضعف نهاده و بدون انکار
فضل گذشتگان در اتخاذ برتری هاے
ادبی اروپا باحتیاط و نظر انتقاد
مداومت دارد—

——:o:——

بایں طرز گمان می رود که ایران
قدیم هر روز روشن تر گشته و طرز
هاے فهمیده اروپا مانوس و موافق
تر با زبان ما شده بالاخره ادبیات
ایران در همیں نزدیگی ها ترکیبے
صحیح از ادبیات هر دو کشور شده

که لفاظی کی قوت اور دکھاوے کے
فریب سے اپنے بیان کو کلام روح بناکر
پیش کرے تو اُس سے سامعین اور
ناظرین کی روحوں میں کبھی کوئی
اثر پیدا نہیں ہوتا اور اس کے دروغ
کو فروغ نہیں نصیب ہوتا-اس طرح
سے دوبارہ پرانے لوگوں کے اس قول
کی تصدیق ہوئی کہ—
ع: ” سخن کزدل بروں آید نشیند
لاجرم در دل “

——:o:——

چونکہ ان لوگوں نے یورپ کو
اچھی طرح سے جان لیا-تھا اس لئے
انھیں یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ وہاں
کے ہر مصنف کی دھاک پڑھنے والے
کی روح پر نہیں بیٹھتی اور صرف
چندھی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو
روحوں کی گفتگو کی ترجمانی کرسکتے
اور جانوں کے درمیان رشتۂ گفتگو
قایم کرسکتے ہیں-اب ان کو معلوم
ہوگیا کہ جدت پسندوں کے پہلے
گروہ نے ہماری اور خارجی ادبیات
میں جوکچھ فرق نکالا تھا وہ تمام تر

هم موانع کهنه برداشته گردد و هم
محاسن جدید مستقر شود—

—:o:—

این تجدد اخیر بیشتر در نثر
روی داده و نظم ایران با جزئی
استثنای یا در حال قبل از مشروطیت
یعنی تقلید صورت و معنی قدما باقی
است یا در حالت تجدد ناقص اوایل
مشروطیت که گسیختگی کامل از قدیم
است در گردش و انقلاب است—

—:o:—

مصنوعی تھا اور جو حلاوتیں انھوں نے
یورپ سے پائیں اور جو جو عیب
ایرانی ادبیات میں نکالے وہ سب
سطحی اور تیسرے اور چوتھے درجہ
کے ہیں—

اب یہ لوگ دوبارہ اپنے محبوب
ایران کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُس
غواص کی طرح جو شکارگاہ کو چھوڑکر
اپنے آپ کو پھر دریامیں غوطہ لگاتے
ہوئے دیکھتا ہے۔ یورپ اور ایران
قدیم کی گہرائیاں اُن کی غواصیوں کی
جگہ بنیں اور اِن دونوں ممالک کی
ادبیات میں مطابقت پیدا کرنا اُن کا
مطمح نظر ہوگیا۔ اب چونکہ قدیم
ایرانی ادبیات کی حلاوتیں بھی
لوگوں کو معلوم ہوچکی ہیں اس لئے
یورپ کی کورانہ تقلید میں کمی
واقع ہوگئی ہے۔ آج کل ادبیات یورپ
کی برتری ثابت کرنے کے لئے قدما کی
بزرگی سے انکار نہیں کیاجاتا اور
تقلید احتیاط اور نقادانہ نظر کے ساتھ
کی جاتی ہے—

ان باتوں سے ہم قیاس کرسکتے

لیکن مسلم است که نظم نیز
بزودے راہ نثر را پیش گرفته واز
هر دو حال خارج شدہ رو بتکامل
خواهد نهاد—

——:o:——

شعراے عالیقدرے درین راہ
اندیشه می کنند و کارهاے آنها تا
درجۂ قابل ملاحظه شدہ است نام
بردن از انها واز نثر نویسانے که چه در
ترجمه وچه در تالیفات خود تجدد را
تعدیل کردہ وزبان را قوام بخشیدہ
اندازموجب ریا میشود بهترین گواہ

هیں که قدیم ایران نت نئی رونق
حاصل کرے گا یورپ کی پسندیدہ
روش بهی هماری زبان سے زیادہ
مانوس اور اس کے مناسب حال هوتی
جائے گی اور رفته رفته دونوں ممالک
کی ادبیات کی آمیزش سے ادبیات
ایران کی ترکیب صحیح طریقه پر
هوسکے گی۔اُدهر پرانی رکاوٹیں
دور هوں گی اور ادهر جدید محاسن
کا تعین هوگا—

یه آخری جدت زیادہ تر نثر میں
هوئی هے اور ایرانی نظم (مستثنیات
سے قطع نظر) یا تو اب تک ویسی هی هے
جیسی که مشروطه سے پهلے تهی یعنی
قدما کی ظاهری اور معنوی پیروی
هنوز باقی هے۔یا پهر آغاز مشروطه کے
وقت جو ناقص حالت تکون تهی یعنی
روش قدیم سے پوری طرح علیحدگی
اُس میں پڑی هوئی هے۔مختصر یه که
گردش وانقلاب میں هے۔لیکن یه امر
یقینی هے که عنقریب نظم بهی نثر هی
کی شاهراہ پر پڑ جائے گی اور (افراط
وتفریط دونوں حالتوں سے علیحدہ

آثار آنہاست کہ بر ہیچ جوئندہ اے

پوشیدہ نمی ماند—

——:o:——

ہو کر کمال کو پہونچے گی۔شعرائے
عالیقدر اسی فکر میں ہیں اور اُن کے
کارنامے بہت کچھہ قابل ملاحظہ ہیں۔
اُن کو اور اُن نثرنویسوں کو جنھوں نے
خواہ ترجمہ میں ہو یا ذاتی تالیفات
میں جدت پسندی کے رجحان کو معتدل
بنایا اور ہماری زبان میں چاشنی
پیدا کی نام بنام بتلانا ریا پر محمول
کیاجائے گا۔اُن کے بہترین گواہ خود
اُن کے آثار ہیں جو کسی ڈھونڈھنے
والے کی نگاہوں سے چھپے نہیں
رہ سکتے—

——:o:——

خطبات گارساں دتاسی

(بقیہ خطبہ پنجم)

علاوہ ان فسانوں کے جو منظوم ہیں اور جو عام قصوں پر مبنی ہیں اور بہت سے فسانے ہیں جن کے ہیرو اور ہیروئن چنداں مشہور نہیں-ہندوستانی زبان میں ان کی ایک بڑی تعداد ہے اور ان میں اکثر مشہور ہیں-یہاں میں چند فسانوں کے تذکرے پر اکتفا کرتا ہوں مثلاً قصہ بلند اختر جو میر نے بیان کیا ہے قصۂ رضواں شاہ جس کے میں نے دو اڈیشن دیکھے ہیں قصۂ چندر بدن اور مہیار جن کے متعدد اڈیشن ہیں قصۂ دلربا و دلارام جو موتی رام کی تالیف ہے قصۂ ماہ سیہاب اور پری رخ جس پر وجہی نے ایک مثنوی لکھی ہے-فسانۂ عجائب جو سرور کانپوری کی تصنیف ہے اور جسے چہار درویش کے برابر شہرت حاصل ہوئی ہے—

میں ایسے قصے گنانے سے بدمزگی پیدا کرنا نہیں چاہتا میں نے اُن میں سے اکثر فسانوں کا ترجمہ اور خلاصہ کیا ہے جن کے دیکھنے سے ان کے طرز بیان اور ترتیب کے متعلق اندازہ کیا جا سکتا ہے-عام طور پر ان قصوں کی ابتدا ہیرو یا ہیروئن کی جسمانی یا اخلاقی تعریف سے ہوتی ہے اس کے بعد ان کی پیچیدہ اور عجیب و غریب سرگزشت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس سے دونوں کے وصال میں موانعات پیدا ہوتے ہیں آخر میں عاشق و معشوق کی ثابت قدمی اور وفا کا تذکرہ ہوتا ہے جس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں-بعض

اوقات مگر بہت کم ان افسانوں کا اختتام ناکامی اور فراق دائمی پر ہوتا ہے۔ میر کی مثنوی "دریائے عشق" مجروح کی "اعجاز عشق" اور راخی کی "مہر و ماہ" کا یہی حال ہے —

ہندوستانی ادب و شاعری کی ایک اور شاخ ہے جس میں اُن مناظر فطرت کی تصویر کھینچی جاتی ہے جن کا تعلق سال کے موسموں اور مہینوں کی خصوصیات سے ہوتا ہے۔یہ نظمیں بارہ ماسے کہلاتی ہیں ان میں موسموں کی حالت کے بیان کے سوا اور کچھہ بھی نہیں پایا جاتا بعض اوقات ان کا انداز بالکل ناٹک کا سا ہو جاتا ہے مثلاً یہ فرض کیا جاتا ہے کہ ایک عورت کا شوہر سال بھر سے کسی دور دراز مقام پر ہے جس کے فراق میں یہ بیتاب ہے۔اس ہجراں نصیب عورت کے شکووں کے ساتھہ ساتھہ نظم میں مناظر فطرت کی تبدیلیوں کا بیان بھی ہوتا ہے اسی کے ساتھہ خود کلامی کا دلفریب نمونہ بھی نظر آتا ہے پھر یہ عورت کسی طائر کو اپنا قاصد بنا کر شوہر کے پاس بھیجتی ہے یہ طائر اکثر وہ ہوتا ہے جس کے نغمے خاص طور پر مقبول خاص و عام ہیں (مثلاً کوئل۔ پپیہا۔بلبل۔شامہ۔دوا) (ملاحظہ ہو ایشیاٹک جرنل سنہ ۱۸۵۰ ع جس میں میں نے ہندوستانی مکالموں کی تشریح کی ہے) —

اس مضمون کو متعدد شعرا نے بالتفصیل باندھا ہے اور ان میں مناظر فطرت کے علاوہ ہندؤں اور مسلمانوں کے مذہبی اور معاشرتی تہواروں کے تذکرے بھی آجاتے ہیں۔اس قسم کی متعدد نظمیں ہیں جن میں سے اکثر کا ذکر میں نے اس سے پہلے کیا ہے —

بعض نظمیں بالکل نرالی ہیں جیسے "پھول چرتر" جس میں ہندوستان کے پھولوں کا ذکر ہے۔اسلامی ادب میں ایک خاص قسم کی تصنیف ہوتی ہے جس میں متعدد افسانے مل جاتے ہیں یہ ہمارے ملک کے افسانوں سے بالکل جدا ہے۔یہ متعدد افسانے ایک سلسلہ میں مربوط ہوتے ہیں جن میں وحدت

مضمون کی رعایت ہوتی ہے ایسے افسانوں کا نتیجہ کبھی اخلاقی کبھی فلسفیانہ اور کبھی مذہبی ہوتا ہے۔اس قسم کی چند مشہور تصانیف "کشف الاسرار" منطق الطیر اور اخوان الصفا ہیں۔ایسی اور بھی تصنیفیں ہیں جو کافی طور پر مشہور ہو چکی ہیں۔اخوان الصفا ہندوستان میں اکرام علی کے عمدہ ترجمہ کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی ہے اس میں یکے بعد دیگرے کئی جانور آتے ہیں اور اپنے کمالات اور خوبیوں کا اظہار کرتے ہیں اور انسان سے دعویٰ ہمسری کرتے پائے جاتے ہیں۔یہ بالکل سچ ہے کہ جانوروں کے کردار میں خداوند عالم نے بہت سی ایسی باتیں رکھی ہیں جو ہمارے لئے قابل تقلید ہیں۔اسی لئے انگریزی افسانہ نگار "گے" لکھتا ہے—

"شہد کی مکھی کی دائمی جد و جہد میری روح کو جگا دیتی ہے اور درس مشقت دیتی ہے۔کون ہے جو دور اندیش چیونٹی کو دیکھکر مایحتاج کی فراہمی کا سبق نہ سیکھے گا۔میرا کتا جو وفاداری میں تمام جانوروں سے ممتاز ہے مجھ میں وفا و عقیدت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔فاختہ سے مجھے مستقل مزاجی اور اہل خانہ سے سچی محبت کرنے کا سبق ملتا ہے اور آزاد پرواز والے پرندے مجھے پدرانہ فرائض کی تلقین کرتے ہیں"۔

اس قسم کی تصانیف میں قصے کا حاصل یعنی اخلاقی سبق ضرور ہوتا ہے۔اس صنف کی سب سے مشہور کتاب "پنچ تنترا" ہے یعنی پانچ باب۔اصل کتاب سنسکرت میں ہے جس کا ترجمہ ہندوستانی زبان میں ہوا اس کتاب کے اکثر قصے یورپ کی مختلف زبانوں میں مختلف صورتوں میں آگئے ہیں چنانچہ ہمارے یہاں کے مشہور مصنف لافونیٹن کی بدولت اس کا سب سے زیادہ مشہور افسانہ ہمارے ملک میں شہرت پا چکا ہے—

اہل ہند کو ناٹک کا اب بھی ویسا ہی شوق ہے جیسا اُن کے اسلاف کو تھا لیکن اس کا اہتمام خاص خاص مواقع پر ہوتا ہے۔چنانچہ حال ہی میں

کلکتہ کے ایک متمول مسلمان گھرانے میں یوسف زلیخا کا ناٹک ہوا تھا ایسے ناٹک کے کھیل اکثر مذہبی ہوتے ہیں اور عشرہ محرم میں ماتم حسین علیہ السلام کی سالانہ یادگار میں کئے جاتے ہیں ان میں سب سے زیادہ مشہور وہ ہیں جن میں آنحضرت صلعم کی وفات یا شہادت امام حسن علیہ السلام اور خاصکر شہادت امام حسین علیہ السلام کا ذکر ہوتا ہے* امام حسین کے سانحات اور ان کے مصائب ان ڈراموں کا خاص مضمون ہے۔اب رہے ہندو سو وہ خوشی کے تہوار مثلاً ہولی کے موقع پر اس قسم کے ناٹک کرتے ہیں۔ان ناٹکوں کو سوانگ کہتے ہیں بعض اوقات یہ بعینہٖ اُسی طرح فی البدیہہ موزوں کئے جاتے ہیں جس طرح ہم لوگ خانگی جلسوں میں دل بہلانے کے لئے چھوٹے چھوٹے افسانے گھڑ لیتے ہیں مگر ان ہندو ناٹکوں کی زبان شستہ اور مہذب نہیں ہوتی۔بایں ہمہ ان میں بھی بعض وقت وہی مضامین ہوتے ہیں جو سنسکرت کے ڈراموں میں پائے جاتے ہیں چنانچہ راگ ساگر ''ہنومان ناٹک'' کی مثال پیش کرتا ہے جو سنسکرت ڈراما سے لیا گیا ہے اور ولسن نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔

اس سے پہلے میں ذکر کرچکا ہوں کہ مشرق کے مسلمانوں میں ایک خاص شعبۂ تصنیف ہے جسے تذکرہ کہتے ہیں۔ایک دوسرا شعبہ انشا ہے جسے میں نظر انداز نہیں کرنا چاہتا۔انشا کے لغوی معنی ایجاد کرنے کے ہیں۔اس سے رقعات کی کتاب مراد ہے یا بالفاظ دیگر کسی مصنف کے قابل تقلید خطوں کا مجموعہ۔انشا خط نویسی میں عبارت آرائی سکھاتی ہے۔ہندوستان میں انشا کی مشہور کتابیں یہ ہیں۔انشاے فیض (فیض نے پند نامۂ عطار کا ترجمہ بھی کیا ہے جو سنہ ۱۸۵۰ء میں بمقام کانپور طبع ہوا) انشاے خالق (کرامت اللہ)

* ہندوستان میں ایسا نہیں ہوتا شاید ایران میں محرم کے زمانے میں اس قسم کے ڈرامے ہوتے ہیں۔مترجم۔

انشاے نظام الدین ساکن پونہ یہ زمانۂ حال کے مصنف ھیں اور انہوں نے حکایات لقمان کا ترجمہ بھی کیا ھے-چرونجی لعل کی انشا بھی اسی زمانہ کی ھے اور یہ آگرہ میں بہ عنوان انشاے اُردو طبع ھوئی ھے-انشاے یوسف دکن ید جیسا کہ نام سے ظاھر ھے دکن کے مصنف ھیں-میں سب سے آخر میں انشاے ھرکرن کا ذکر کرتا ھوں جس نے فارسی زبان میں بڑی شہرت حاصل کی-اس کا ترجمہ بھی ھندوستانی زبان میں ھوا ھے—

ھندوستانی زبان میں السنیات پر بہت سی کتابیں ملتی ھیں جو ایشیائی زبانوں کے سیکھنے والوں کے لئے بے حد مفید ھیں-میں صرف چند کے تذکرہ پر اکتفا کرتا ھوں-مثلاً سنسکرت کی صرف و نحو کے متعلق ھندوستان میں ایک کتاب لکھی گئی ھے جس کا نام مفتاح اللغت ھے-سنسکرت کی صرف و نحو مولفۂ لگھوکومادی کا ترجمہ بھی کیا گیا ھے جو بنارس میں سنہ ۱۸۴۵ ع میں طبع ھوا مصدرالافاضل فارسی زبان کی صرف و نحو ھے جو مظہرالدین نے لکھی-میزان فارسی یہ بھی اُردو میں ھے-مظہرالنحو عربی زبان کی نحو ھے اور اُردو میں لکھی گئی ھے-اُردو زبان کی ایک لغت جس میں شعرا کے کلام کے اسناد ھیں-لغت السعید بھی اُردو زبان کی لغت ھے-ایک اور اُردو لغت جو سنہ ۱۸۵۱ ع میں آگرہ میں طبع ھوئی-اس کے علاوہ اُردو صرف و نحو پر کئی کتابیں ھیں جن میں سے ایک صہبائی کی ھے انہوں نے علم اللسان پر کئی کتابیں لکھی ھیں- "بھاشا پنگل" جو بھاکا عروض پر ھے اس کے کئی اڈیشن نکل چکے ھیں—

آخر میں انگریزی صرف و نحو کی کتابوں کا ذکر کروں گا جو رام کرشن اور دیگر مصنفین نے ھندوستانی میں لکھی ھیں-تاریخ جس کا وجود سنسکرت میں صرف افسانوں کی صورت میں ھے ھندوستان کے موجودہ ادب میں ھر جگہہ نمایاں ھے-مگر اُس کی حیثیت معمولی ھے حالانکہ نظموں میں تاریخی واقعات کا تذکرہ کثرت سے کیا گیا ھے جن میں سے بیش قیمت معلومات

بہم پہنچتے ہیں جو دوسری جگہ کمیاب ہیں —

میں نے ابھی تاریخی نظموں کے سلسلہ میں چند اور دوسروں کا نام لیا ہے - چند کو راجپوتانہ کا ہومر اور تھوسیڈ ائڈیس کہا جا سکتا ہے - تاریخی نظمیں بہت سی ہیں مثلاً لال کوی کی چرتر پرکاش جو چتر شال راجہ بندھیلکھنڈ کی تاریخ ہے اور گو پاچک کتھا یا تاریخ گوالیار - ایسی اور متعدد نظمیں ہیں مثلاً راجہ ویلاس جو رانہ راج سنگھہ راجہ میواڑ اور مشیر اورنگ زیب کے شاعر مان کبیشر نے لکھی - ٹاڈ صاحب نے اپنی تاریخ راجستان میں اس سے بہت مدد لی ہے - ھمیرراس جو ھمیر راجہ چتوڑ کی تاریخ ہے - ہری چندر لیلا (تاریخ راجہ ہری چندر) سورج پرکاش (تاریخ خاندان سورج بنسی) کرن کی تصنیف ہے جو عمدہ شاعر اور بہادر سپاہی تھا - یہ نظم در حقیقت ابھے سنگھہ راجہ میواڑ کی تاریخ ہے جس نے سنہ ۱۷۲۴ ع سے سنہ ۱۷۲۵ ع تک حکومت کی مگر کتاب میں بطور مقدمہ کے راتھوروں کی عام تاریخ سے بحث کی گئی ہے جو سورج بنسی سے تعلق رکھتے ہیں - دوسری نظم گرب چنتا منی یہ بھاشا میں ہے اور اس میں گجرات کے مشہور راجہ کرن کے حالات ہیں جس کو سلطان علاءالدین محمد شاہ سکندر ثانی نے دسویں صدی کے آخر میں شکست دی اور ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا - ایسی ہی ایک نظم راج پٹن (تاریخ میواڑ) رنچھوڑ بہٹ کی لکھی ہوئی ہے - ایک اور نظم رشا بھاچرتر (ایک مشہور جینی بزرگ کی تاریخ) ہے ونس کلی یعنے شجرۂ خاندان بھوت کی تصنیف ہے - جے سنگھہ نے ایک تاریخی رسالہ بھی لکھا ہے جو کالپادروما کے نام سے مشہور ہے ہندوستانی زبان میں جتنی تاریخی نظمیں ہیں سب کی سب ہندوستانیوں کی ہیں انہوں نے اسلامی مضامین پر بھی خامہ فرسائی کی ہے —

مثلاً ہری ناتھہ کی لکھی ہوئی تاریخ محمد شاہ جس کا نام پوتھی

محمد شاہ ہے اس قسم کی جو کتاب اُردو میں ہے وہ یا تو ترجمہ ہے یا تالیف۔ البتہ چند رسالے ایسے ہیں جو خاص دلچسپی رکھتے ہیں اور اُن سے الگ ہیں—

ان کے علاوہ میں اب اُن دلچسپ تاریخی کتابوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو دہلی اور آگرہ پر لکھی گئیں۔ مثلاً آثار الصنادید اور تاریخ آگرہ وغیرہ۔ کلکتہ نامہ بھی اسی طرز کی تصنیف ہے فرق صرف اتنا ہے کہ یہ منظوم ہے۔ علی نامہ (علی عادل شاہ کی سوانح جات) واقعات گورکھا جو نیپال کا صوبہ ہے جہاں کے راجہ نے اپنی سلطنت سارے نیپال میں پھیلا رکھی تھی۔ ایک نظم تباہی سومنات پر ہے۔ ایک تاریخ نور محمد کی ہے جس میں بنگال کے قیام فرنگ کے تذکرے ہیں۔ اسی طرح دھرم نرائن کی تاریخ سندھیا ہے۔ ان کے علاوہ ہندوستانی زبان میں تیمور۔ بابر۔ اکبر۔ جہانگیر کے دلچسپ حالات ہیں جو یا تو فارسی سے ترجمہ کئے گئے ہیں یا اُس کے اتباع میں لکھے گئے ہیں مثلاً پتمبر سنگھ موہن لعل اور علی حزیں کے تذکرے—

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اہل مشرق میں تاریخ کا اتنا لحاظ نہیں رکھا جاتا جتنا کہ ہم میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ حال کے ایک ہندوستانی مورخ نے اپنی کتاب کی سرخی کے لئے حافظ کا یہ شعر منتخب کیا ہے—

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو

کہ کس نکشود و نہ کشاید بہ حکمت این معمہ را

سفر ناموں کے سلسلے میں یوسف خاں لکھنوی کا سفر فرانس و انگلستان (سنہ ۱۸۳۸ ع) کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو دہلی میں شائع ہوا۔ کریم خاں دہلوی کا سفرنامۂ لندن بھی قابل ذکر ہے۔ صاحب موصوف نے سنہ ۱۸۴۰ ع میں لندن کا سفر کیا تھا۔ اس کا ترجمہ میں نے اورینٹل ریویو میں شائع کیا ہے۔ ان میں سے قبل الذکر صاحب پٹھان قوم کے صوفی منش آدمی تھے۔ ان کا عرف

کھمل پوش ہے کیوں کہ یہ ہمیشہ کمل اوڑھے رہتے تھے۔

مجھے ہندوستانی زبان کا تبصرہ ہندؤں اور مسلمانوں کے مذہبی فلسفہ سے شروع کرنا چاہئے تھا کیوں کہ اِس موضوع پر بہت سی دلچسپ کتابیں موجود ہیں۔اہل ہنود کے فلسفۂ مذہب پر کبیر پنتھیوں سکھوں اور جینیوں کی کتابیں قابل ذکر ہیں۔اِن میں غیر معمولی بات یہ ہے کہ اکثر کتابیں شیوائیوں کی ہیں مثلاً مہادیو ہرتر (تاریخ شیوجی) شیو لیلا مری تم (شیو جی کے لیلا کی خوشبو) گورا منگل (شیوجی اور پاربتی) کی شادی وغیرہ۔

مسلمانوں کے فلسفۂ مذہب یعنے دینیات کے متعلق ہندوستانی زبان میں یا تو اسلامی مذہب یا عبادات پر کتابیں لکھی گئی ہیں یا ایسی کتابیں جن سے اُن کے اعتقادات کا سیاسی ارتقا ظاہر ہوتا ہے۔حضرت محمد صلعم۔ حضرت فاطمہ و امام حسن و حسین کے تذکرے ہیں۔نیز حضرت مسیح اور بی بی مریم کا ذکر بھی مسلمانوں نے اسی احترام و عقیدت سے کیا ہے حالانکہ وہ ہمارے مسئلہ تثلیث کے قائل نہیں۔

ہندوستان میں شیعوں کی تعداد کافی ہے۔مگر دینیات پر ہندوستانی زبان میں زیادہ تصانیف سنیوں ہی کی ہیں۔کچھہ کتابیں ایسی بھی ہیں جو شیعوں کی وجہ سے وجود میں آئیں لیکن اسلامی دینیات میں سب سے زیادہ عجیب وہ کتابیں ہیں جو سید احمد کے فرقے (ہندی وہابیوں) اور روشنائی فرقے سے تعلق رکھتی ہیں یاجو اِن کتابوں کی تردید میں لکھی گئیں۔

سیاست اور فقہ ہندوؤں میں بھی اسی طرح ملے جلے ہیں جس طرح مسلمانوں میں۔دیوانی قانون تو بالکل شریعت میں داخل ہے۔اس صنف کی چند عمدہ کتابیں ہندوستانی زبان میں ہیں مگر وہ سب ترجمے ہیں۔

سائنس اور فنون پر کوئی قابل ذکر کتاب نہیں۔ایسی کتابیں زمانۂ حال

کی پیداوار ھیں اور انگریزی تصانیف کے ترجمے یا تقلید پر مبنی ھیں مگر یہ ترجمے ان باشندوں کے لئے بہت مفید ھیں جن کے لئے یہ لکھے گئے ھیں۔یہ ترجمے مختلف نوع کے ھیں جن سے ھندوستانیوں کو علوم کے مختلف شعبوں کا حال معلوم ھوتا ھے۔ان میں سے چند ایسے بھی ھیں جو زمانۂ حال کی بالکل تازہ تحقیقات سے بحث کرتے ھیں —

ان کتابوں میں جو ایسے مضامین پر لکھی گئی ھیں جن کا ذکر فقرۂ بالا میں کیا گیا ھے چند حقیقی تصنیف بھی ھیں بعض فن تعمیرات اور سنگ تراشی پر ھیں۔بعض میں درختوں اور جڑی بوٹیوں کے طبی خواص سے بحث کی گئی ھے جن سے مشرقی فن طب میں علاج کیا جاتا ھے۔علاوہ دوسری بوٹیوں کے چوب چینی کے خواص کا بھی ذکر کیا گیا ھے۔چند کتابیں ایسی ھیں جن میں باز اور بحریوں کو شکار کے لئے تیار کرنے کے طریقے بتائے گئے ھیں۔یہ ان تصانیف سے بہت مشابہ ھیں جن سے ڈی ھیمر مرحوم نے ھم کو روشناس کرایا۔کچھ کتابیں مویشیوں کے علاج۔موتیوں کے اوزان اور قیمت۔شطرنج کے کھیل۔خواب کی تعبیروں اور فن طباخی پر ھیں —

ھندی ادب کی سب سے زیادہ اھم شاخ وہ ھے جس میں دیگر مشرقی زبانوں سے ترجمے کئے گئے ھیں۔ان ترجموں سے سنسکرت۔عربی۔فارسی جیسی قدیم زبانوں کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ھے۔کیونکہ اس میں اصلی تصانیف کے لطف کو برقرار رکھا گیا ھے۔جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ھے کہ ترجمے بھی اُسی ماحول۔مناظر اور رسم و رواج میں ھوتے ھیں جن میں اصل کتابیں لکھی گئی تھیں۔میں پہلے ان کا تذکرہ کرچکا ھوں اور اعادہ کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔مجھے ھندوستانی زبان میں ویدوں کے کسی ترجمے کا علم نہیں مگر ابھی ایک ترجمہ کا اعلان کیا گیا ھے جو ھندؤں کی مقدس کتابوں کے ایک طویل سلسلہ کا پہلا حصہ ھوگا۔کلام مجید (قرآن) کے بہت سے ترجمے ھیں جن میں تصحیح کا بہت لحاظ رکھا گیا

هے ۔ سید احمد نے اپنی کتاب آثار الصنادید میں شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے ترجموں کا ذکر کیا ہے ۔ ترجموں میں اکثر حاشیے اور تفسیر بھی دی گئی ہے ۔ ایک ترجمہ دھلی میں شائع ہوا تھا جس میں زیادہ رواداری پائی جاتی ہے کیونکہ اس میں سنیوں کے نقطۂ نظر سے بھی مطالب بیان کئے گئے ہیں اور شیعوں کے اعتقادات کے مطابق شرح بھی کی گئی ہے ۔ عشرت نامی ایک صاحب نے قرآن کی منظوم شرح لکھی ہے ۔ میں اس سلسلے میں یہ بھی بتانا چاھتا ہوں کہ ھندوستان کے لوگ ایرانیوں کے مثل اور ترکوں کے برخلاف اپنی مذھبی کتابوں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے کو معیوب نہیں خیال کرتے اور ھندوستانی عورتیں جمعہ کے دن اُسی طرح تلاوت قرآن کرتی ہیں جیسے کہ انگریزی عورتیں اتوار کے دن انجیل پڑھتی ہیں ۔ ھندوستانی عورتیں عام طور پر ترکی عورتوں سے زیادہ تعلیم یافتہ ہوتی ہیں جو سب سے زیادہ اپنے حسن کی وجہ سے مشہور ہیں ۔

سنسکرت کتابوں کے ترجموں میں سے میں " مہابھارت " " ھیتوپدیس ترک سنگرھا " کو پیش کرتا ہوں ۔ آخرالذکر کتاب ھندوستانی فلسفہ پر سنسکرت زبان میں اونم بھٹر نے لکھی ہے یہ کتاب بنارس میں ۱۸۵۲ ع میں شائع ہوئی اور یہ ایک ھندیات کے محقق بیلنٹائن نامی کی کوششوں کا نتیجہ تھا جو میرے ایک دوست کپتان جے میچل کا بھتیجا (بھانجا) ہوتا ہے اس جلد میں اصل سنسکرت عبارت بھی ہے اور ھندی اور انگریزی ترجمہ بھی ہے ۔ ڈرامے بھی لکھے گئے ہیں یعنی وہ خاص ڈرامے جن کا ترجمہ ولسن نے سنہ ۱۸۴۵ ع میں دھلی میں کیا ۔ دوسرا ڈراما ماھنا ستوترا ہے ۔ جس کو سمر سنگھہ نے سنسکرت سے ترجمہ کیا حالانکہ یہ تصنیف شیوائی ہے ۔

سنہ ۱۸۴۵ ع میں دھلی میں رگھوبنس کے ترجمہ کا انتظام ہو رہا تھا جو کالیداس کی تصنیف بتائی جاتی ہے اور جس میں رگھو خاندان کے حالات

ھیں۔ادیاتھا کی رامائن کا ترجمہ اور دوسرے تراجم بھی سنسکرت سے کئے جارھے تھے۔مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کام پورا بھی ھوا یا نہیں۔دوسرے تراجم کا ذکر میں نے اپنے افتتاحی خطبے میں کیا ھے—

سنسکرت کے سلسلہ میں مجھے دوسری زبانوں مثلاً تلنگی۔بنگالی۔مرھٹی کے تراجم کا بھی ذکر کرنا چاھئے۔مرھٹی زبان میں دوسری کتابوں کے علاوہ ایک مشہور کتاب ستیانروپن (صداقت) ھے۔عربی ترجمہ کی خاص کتابیں کریم الدین کا ترجمہ تاریخ ابوالفدا سبحان بخش کا ترجمہ ابن خلکان۔اخوان الصفا کا ذکر میں پہلے کرچکا ھوں۔حدیث میں ایک مشہور کتاب مشکواۃ شریف ھے۔فقہ میں ایک اور مشہور کتاب آداب القاضی ھے۔جو شہرت میں قدوری کی برابر ھے جس کا خلاصہ اُردو میں ھوا ھے—

دھلی میں چند صاحبوں نے مقامات حریری کے ترجمہ کا ارادہ کیا مگر ان لوگوں کو اُنہیں وجوہ کی بنا پر اس کام سے دست بردار ھونا پڑا جن کے باعث میں اس کتاب کے فرانسیسی ترجمہ کرنے سے باز رھا۔وجہ یہ ھے کہ ترجمہ میں ان صنائع کا برقرار رکھنا ناممکن ھے جو اس کتاب کی خاص خوبی خیال کی جاتی ھے—

ادب عربی کی مشہور کتاب "الف لیلہ" کا ترجمہ نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ھندؤں نے بھی کیا ھے۔مسلمانوں میں میں حسن علی خان کشمیری کا ذکر کرنا چاھتا ھوں جو ایک ھم عصر مصنف ھیں اور جو دھلی کالج کے پروفیسر تھے۔انہوں نے بہت سے ترجمے کئے ھیں۔دوسرے صاحب شمس الدین احمد ھیں جنہوں نے مدراس میں (۲۰۰ قصوں) کا ترجمہ شائع کیا۔یہ ترجمے کلکتہ والے ایڈیشن کا ھے جو لیتھو میں چھپا ھے اور Habicht اور Heicher کے اڈیشن سے مختلف ھے۔زمرۂ ھنود میں دیا شنکر نسیم ھیں جن کے ترجمے لکھنؤ میں سنہ ۱۲۴۴ ھجری مطابق سنہ ۱۸۲۸ ع میں تین جلدوں میں شائع ھوئے۔حال میں

۵۰ قصوں کے ترجمے دہلی میں شائع ہوئے ہیں نیز ایک انتخاب کتاب کی صورت میں چھپا ہے۔ علاوہ اس کے غنیم پسر تاجر کا ابھی ایک قصہ شائع ہو چکا ہے۔

انجمن اشاعت علوم مفیدہ نے جس کا مقصد یہ ہے کہ ملکی زبانوں کے ذریعے سے ہندوستان کے باشندوں میں مفید علوم کی اشاعت کرے ابوالفدا کے جغرافیہ کا ایک ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس انجمن نے رشیدالدین کی تاریخ مغلیہ کی۔ ابن خلدون کی تاریخ بربری اور دوسری مشہور کتابوں کی اشاعت کا اعلان کیا تھا مگر میرا خیال ہے کہ یہ ترجمے تکمیل کو نہیں پہنچے۔

فارسی زبان سے بہت سے ترجمے کئے گئے ہیں۔ میں چند مشہور فارسی کتابوں کا نام بتا سکتا ہوں مثلاً گلستان جس کے متعدد ترجمے کئی کئی بار چھپے۔ بوستان سعدی جس کا ترجمہ مغل نے کیا۔ اس ترجمے نے بعض مبہم عبارتوں کے معانی کو صاف کر دیا ہے۔ مشہور رزمیہ نظم شاہنامہ جس کا ترجمہ منشی نے خسرواں عجم کے نام سے نظم میں کیا۔ محمد علی ترمذی اور سرور نے اس کے ترجمے سرور سلطانی کے عنوان سے نثر میں کئے ہیں۔ قصہ سہراب کا ترجمہ خاص طور پر قزیلی نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ جلال الدین رومی کی مشہور کتاب مثنوی شریف کے متعدد ترجمے ہوئے ہیں۔ اس کا مکمل ترجمہ نشاط نے کیا اور کریم الدین نے اس کا ذکر کیا ہے۔ مثنوی کے انتخاب کا ترجمہ شاہ مستان نے کیا جو کلکتہ میں سنہ ۱۸۴۵ء میں طبع ہوا۔ یہ دونوں ترجمے نظم میں ہیں۔ ان کے علاوہ دوست نے پند نامہ عطار و پند نامہ سعدی۔ منطق الطیر۔ حسن و عشق۔ اظہار دانش کے ترجمے کئے۔ شرافت نے بہار دانش اور محمد اعظم کی تاریخ کشمیر کے ترجمے کئے۔ تاریخ کشمیر کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں آخر میں میں تاریخ طبری کے ترجمہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو جعفر شاہ نے کیا۔ ان کے علاوہ بھی اور بہت سی کتابیں ہیں۔

چند ہندوستانی تصانیف کے ترجمے بھی دوسری مشرقی زبانوں میں

ہوئے ہیں مثلاً بہاری زبان کی کتاب ست سائی کا ترجمہ سنسکرت میں "باغ و بہار" کا ارمنی میں - راگ درشن اور دوسری اردو کتابوں کا ترجمہ فارسی میں ہوا جسے مشرق کی لاطینی زبان کہنا چاہئے - مثلاً قصہ دھرم سنگھہ - افسانہ سورج پور جو اخلاقی افسانے ہیں - پہلی کتاب کا نام فارسی میں قصہ صادق اور دوسری کا شمس آباد ہے - ہندوستان میں مشرقی زبانوں کے ساتھہ ساتھہ انگریزی سے بھی ترجمے ہوئے ہیں جس کو نئے حکمرانوں کا ادبی خراج سمجھنا چاہئے - فرانسیسی کتابوں کے بھی ترجمے ہوئے ہیں - مثلاً عیسائی (کیتھالک) پادریوں کی کوشش سے فلوری کی "ہستارکل کیتیچزم" اور ہمارے مشہور مشرقی "دی ساسی" کی عربی قواعد کا ترجمہ دہلی میں تیار کیا جا رہا ہے - اسی طرح رالن کی مختصر تاریخ قدیم کا ترجمہ بھی ہو رہا ہے - مگر ہندوستان میں فرانسیسی کتابوں کے ترجمے زیادہ تر انگریزی کی وساطت سے ہوئے ہیں - یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے ملک کے "ایلی دی بیوما" جیسے لائق مصنفین کو خبر بھی نہیں کہ ان کی تصانیف کا مطالعہ ہندوستانی کے ذریعہ سے آگرہ اور دہلی میں ہوتا ہے اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ سید احمد نے اپنی کتاب "تفسیر انجیل" میں عبرانی زبان سے انجیل کے ترجمے کا ارادہ کیا ہے —

یہ ترجمے جو ہندوستانیوں کو ہمارے علوم و فنون اور قدیم و جدید تاریخ مثلاً تاریخ یونان و روما سے روشناس کرانے کے لئے کئے جاتے ہیں یقیناً بہت مفید ہیں ان کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے جب دیکھا جاتا ہے کہ ترجموں میں رسیلاس - قزلباش - ویکار آف ویک فیلڈ - رابنسن کروسو - سفر نامہ بنیان - اکانامی آف ہیومین لائف جیسی اعلی ادبی تصانیف بھی شامل ہیں - ان تصانیف میں ایک بڑی بات یہ ہے کہ وہ غیر محسوس طور پر عیسائی مذہب کی تعلیم دیتی ہیں - یہ مذہب ایسا روح پرور درخت ہے کہ جس کی شاخیں

یہودا سے نکل کر سارے عالم میں پھیل گئی ہیں۔عیسائی کتب کے ترجموں میں چند ایسی ہیں جو نہایت سلیس انداز میں ہمارے اصولوں کی تشریح کرتی ہیں یا ہماری مقدس کتابوں کو مختلف شکلوں میں پیش کرتی ہیں۔ بعض مسلمانوں کی دلائل کی تردید میں ہیں کیوں کہ مسلمانوں کا تعصب عیسائیت کے خلاف بہت سخت ہے—

مذہبی کتب کے ترجموں میں سب سے زیادہ دلچسپ امریکن پرسباٹیرین پادریوں کا شایع کردہ ترجمۂ قرآن ہے جو سنہ ۱۸۴۴ع میں بمقام دہلی شایع ہوا۔اس کے ابتدا میں ایک مقدمہ ہے جس میں مسلمانوں کی غلطیوں پر بحث کی گئی ہے اور عیسائی مذہب کے مخالف اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے متن قرآن کے معانی آیات قرآنی کی تفسیر بھی درج ہے—

ہندوستان میں اس قسم کا کام اول اول پروٹسٹنٹ مشنری بنجمن شلز نے شروع کیا۔اسی مشنری نے بمقام ہیلی سنہ ۱۷۴۴ع میں اس قسم کی کتاب قرآن پاک کے متعلق شایع کی تھی۔مذہبی ترجموں میں اینگلیکن لٹرجی کا ترجمہ اس واسطے کیا گیا کہ ہندوستانی اس کا مطالعہ کر سکیں۔ایک دوسری غایت اس کی یہ بھی تھی کہ کلکتہ اور دوسرے شہروں کے گرجاؤں میں جو دیسی عیسائیوں کے لئے قائم کئے گئے ہیں اینگلیکن لٹرجی کے مطابق ہندوستانی زبان میں اسی طرح عبادت کی جائے جس طرح لندن اور بیت المقدس میں یہودیوں کی آسانی کی غرض سے عبرانی زبان میں ہوتی ہے۔مذہبی گیتوں کے ترجمے بھی انگریزی بحروں کے مطابق ہندوستانی میں کئے گئے ہیں اور وہ گیت سینٹ پال اور وسٹ منسٹر کے گرجاؤں کی طرح ہندوستانی میں بھی گائے جاتے ہیں بعینہ جیسے پیرس کے پروٹسٹنٹ فرقہ والوں نے فرانسیسی الفاظ جرمن سروں کے مطابق ترتیب دیکر قائم کئے ہیں—

کچھ دنوں پہلے ہندوستان میں قلمی کتابیں استعمال ہوتی تھیں۔

کیوں کہ چھاپے کا رواج ہندوستان میں زیادہ نہ تھا اور مطبوعہ حروف کو بدنما
اور بھدا تصور کیا جاتا تھا اور اس میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ نستعلیق خط
کا حسن جو خوش خط قلمی نسخوں میں نظر آتا ھے چھپنے میں زائل ہوجاتا تھا
اور شکستہ خط تو چھپنے میں اور بھی خراب ہوجاتا تھا خوش قسمتی سے لیتھو
نے اِن تمام مشکلات کا ازالہ کردیا ھے۔ طباعت کا یہ طریقہ ہندوستان میں
خوب مقبول ہوا۔ لیتھو گرافی کا پہلا مطبع دہلی میں سنہ ۱۸۳۷ ع میں قائم
ہوا اور سنہ ۱۸۵۲ ع تک صوبہ شمال و مغربی میں ایسے ۳۴ مطبع قائم ہوگئے۔
رفتہ رفتہ ایسے مطبع شمال ہند کے تقریباً ہر شہر میں اور ہندوستان کے تمام
بڑے شہروں میں قائم ہو گئے۔ صرف لکھنؤ اور کان پور میں ۲۳ مطبع تھے جہاں
سے چند سال کے عرصہ میں صدہا کتابیں چھاپی گئیں اور بعض کتابوں کے
کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ آگرہ کے سرکاری گزٹ مورخہ یکم جون سنہ ۱۸۵۵ ع
کی صرف ایک فہرست میں نقشوں اور لیتھو کے نمونوں کے علاوہ دو سو کتابوں
کے نام تھے۔ اِن میں اکثر کتابیں تو ایسی ہیں جن میں ہندوستانیوں کے لئے
ادب سائنس اور فنون کی ابتدائی باتیں بیان کی گئی ہیں جو ہمارے لئے
چنداں دلچسپ نہیں لیکن اسی کے ساتھ ان میں بہت سی کتابیں یورپ کے
علما کے مطالعہ کے قابل بھی ہیں۔ مثلاً کریم الدین کے مرتب کئے ہوئے گلستان اور
انوار سہیلی کے خلاصے۔ امین چند کا سفر نامہ جس میں پنجاب۔ کشمیر۔ سندہ
دکن کے چند مقامات۔ خاندیس۔ مالوا اور راجپوتانہ کے دلچسپ حالات ہیں۔
چندو دیپکا۔ جس میں ہندی نثاری پر بحث کی گئی ھے اور جو یورپ میں
بالکل مفقود ھے —

دہلی کی ایک انجمن نے ادبی اشاعت اور طباعت میں قابل تعریف
کام کیا ھے یہ انجمن ورناکیولر ترانسلیشن سوسائٹی ھے جس کے سکریٹری ابتدا
میں دہلی کالج کے پروفیسر اور ہمارے ہم وطن مسٹر بوترس تھے۔

اس انجمن نے سنسکرت-عربی-فارسی کے آسان اور اچھے ترجمے کر کے هندوستانیوں کی ایک بڑی اور ضروری خدمت کی ان میں انگریزی کی چند بہترین کتابوں کے ترجمے بھی شامل هیں—

طباعت کے سلسلہ میں میں ایک خاص قسم کے ادبیات کا ذکر کرنا چاهتا هوں جو اب تک مشرق میں مفقود تھا مگر اب هندوستان میں نمایاں ترقی کر رها هے-میری مراد اخبارات و رسائل سے هے جن کا اثر هندوستانیوں پر کافی و وافی پڑا اور اس میں روز بروز اضافہ هوتا جاتا هے-میں پچاس سے زائد هندوستانی اخبارات سے واقف هوں-چند سال پہلے کلکتہ میں هندوستانیوں کے سولہ اخبار نکلتے تھے جن میں سے پانچ فارسی یا هندوستانی ۹ بنگالی اور دو انگریزی زبان کے تھے-مولوی نصیرالدین کچھ دنوں تک اپنا رسالہ "مارتندا" نکالتے رهے جو پانچ کالموں میں پانچ زبانوں هندی-هندوستانی بنگالی-فارسی اور انگریزی میں شائع هوتا تھا-ابھی حال میں عورتوں کے لئے ایک رسالہ کی اشاعت کا اعلان هوا هے جو اُردو میں شائع هوگا-بمبئی میں اِس وقت تین چار اخبار عام هندوستانیوں کے لئے اور دو خاص مسلمانوں کے لئے نکل رهے هیں-ان کے علاوہ چار اخبار گجراتی میں پارسیوں کے اور دو مرهٹی میں هندؤں کے شائع هو رهے هیں-چند هندوستانی رسالے مدراس سے نکلتے هیں اور اس سے زائد تعداد میں آگرہ-دهلی-میرتھہ-لاهور-بنارس اور لکھنؤ سے-چند هندوستانی رسالے سریرام پور-کدر پور-مرزا پور بھرت پور ملتان-بریلی اور اندور سے بھی نکلتے هیں-اگر یہ تمام رسالے یورپ میں منگوائے جائیں تو یورپ کے اخباروں میں اشاعت کے لئے ان میں دلچسپ اور عمدہ مضامین مل سکتے هیں—

نظم ہاشمی

از

(جناب مولوی سید ہاشمی صاحب - رکن دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی
حیدر آباد - دکن)
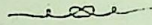
چین ہوا کسے نصیب فرصت مستعار میں
نیند ہے ستر ماندگی دیدۂ ہوشیار میں
عالم ریب و رنج میں موت کا اعتبار ہے
ہے یہ دھنک اُمید کی مطلع پر غبار میں

———:o:———

خندہ و دست و پا زنی کا کوئی مدعا نہیں
دیکھ ظہور زندگی طفلک شیر خوار میں
فصل بہار کی ترنگ رنگ میں غرق ہوگئی
موج - جنون دشت کی چھپ گئی سبزہ زار میں

———:o:———

ناصیۂ سیاہ پر نور سجود ہاشمی
بن گیا آهن آئینہ شوق لقائے یار میں
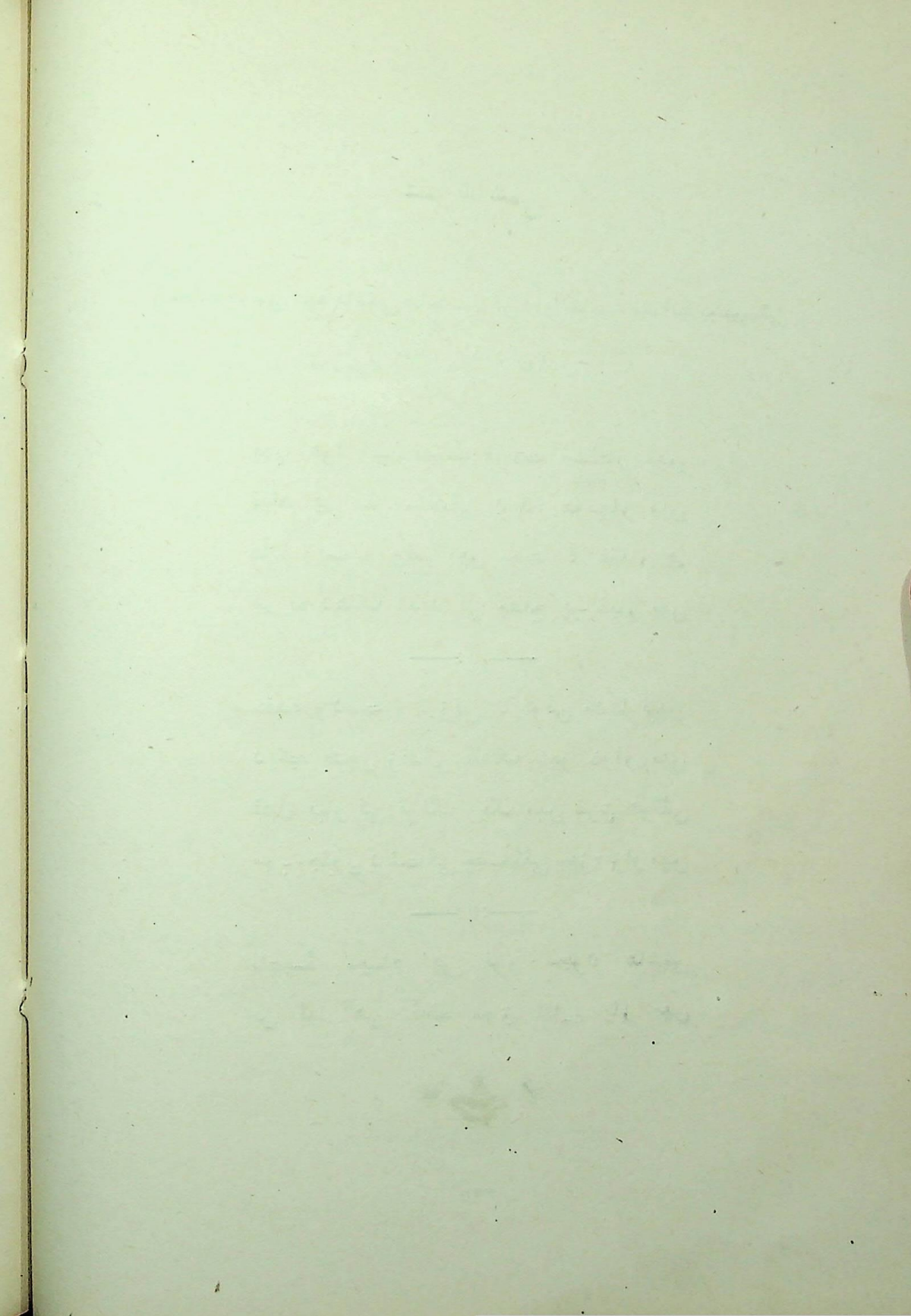
طوطا کہانی اور سب رس

تحفہ کی جدید اشاعت (جلد اول نمبر ششم بابتہ ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۳ ہجری) میں ایک مضمون بعنوان ''طرز بیان'' شایع ہوا ہے - جس میں ایک موقع پر طوطا کہانی کا نام آگیا ہے - وہاں مدیر تحفہ نے ایک طول طویل نوٹ (صفحہ ۲۵۴ سے صفحہ ۲۵۸ تک) اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے - اس نوٹ کو بظاہر اصل مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ محض اڈیٹر اُردو (مولانا عبدالحق بی - اے) کی بعض تحریرات پر نکتہ چینی کرنے کی غرض سے لکھا گیا ہے - مدیر تحفہ کی دانست میں اڈیٹر اُردو سے طوطا کہانی اور سب رس کے متعلق جو فرو گذاشتیں ہوئی ہیں اس نوٹ میں اُن کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے اور بقول مدیر تحفہ کے یورپین حضرات کی تحقیقات صادقہ سے اخذ کرکے اُنہوں نے جو اصلاحات پیش کی ہیں ان کی حقیقت سطور ذیل سے منکشف ہوگی —

مدیر تحفہ لکھتے ہیں کہ

''طوطا کہانی کا ماخذ ایک سنسکرت کتاب ہے - پہلے پہل ضیاء الدین نخشبی نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا - اس کے دکنی اُردو ترجمہ کی نسبت مولوی عبدالحق صاحب گلشن ہند کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ طوطی نامہ ابن نشاطی نے عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں دکنی زبان میں لکھا .... مسٹر آغا حیدر حسن دہلوی پھول بن پر مضمون لکھ رہے ہیں اس میں آغا صاحب نے ثابت

کرد یا ہے کہ ابن نشاطی نے کوئی طوطی نامہ نہیں لکھا"۔

مدیر تحفہ اس بات کو نہیں مانتے ہیں، کہ ابن نشاطی نے طوطی نامہ لکھا اور ان کے اس دعوے کی بنیاد آغا حیدر حسن دہلوی کے مضمون پر قائم ہے۔ چوں کہ آغا صاحب کا مضمون ابھی زیر اشاعت ہے اس لئے ہمیں اس کا علم نہیں ہے کہ ان کے یہاں اس دعوے کی تائید میں کیا دلائل ہیں۔ لیکن یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ابن نشاطی کے طوطی نامہ سے انکار کرنا حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے۔ اس طوطی نامہ کا ایک نسخہ ٹیپو سلطان کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ چنانچہ میجر اسٹوارٹ نے اس کتاب خانہ کی جو فہرست لکھی ہے اس کے صفحہ ۱۸۰ پر اس کا مفصل تذکرہ مرقوم ہے۔ پروفیسر ٹاسی نے پیرس میں اور ڈاکٹر ولسن نے مدراس میں اس کے باتصویر نسخے دیکھے ہیں۔ اس وقت اس کا ایک نسخہ قطب شاہی کتب خانہ کا ڈاکٹر سید محمد قاسم صاحب معالج سہیات کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ آگے چل کر طوطی نامہ کی نسبت مدیر تحفہ یہ ضافہ کرتے ہیں کہ:

"مولوی عبدالحق صاحب رسالہ اردو بابتہ جولائی سنہ ۱۹۲۴ء صفحہ ۴۹۶ میں حیدری کی تصنیفات گناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی ایک کتاب طوطا کہانی ہے جو فارسی طوطی نامی کا ترجمہ ہے۔ نخشبی کے طوطی نامہ کا خلاصہ محمد قاسم نے کیا تھا اس کا یہ ترجمہ ہے۔

ہمارے پیش نظر طوطا کہانی کا ایک نسخہ مطبع محمدی بمبئی کا سنہ ۱۸۹۴ء کا چھپا ہوا ہے۔ اس کی پیشانی پر تحریر ہے کہ طوطا کہانی ترجمہ کیا ہوا منشی بے بدل شاعر بے مثل جناب منشی حیدر بخش المتخلص بہ حیدری کا طوطی نامہ فارسی قادر بخش کے سے۔ قادر بخش نے طوطی نامہ فارسی میں نہیں لکھا بلکہ دکنی اردو میں لکھا ہے اس کا ایک نسخہ عثمانیہ یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔ ہماری نظر سے بھی طوطی نامہ کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ سنہ ۱۱۴۲ ھ م سنہ ۱۷۳۱ء

گزرا ہے جس کو دکنی میں ملک محمد قادری نے لکھا ہے۔جان گلگرسٹ نے حیدری سے جو طوطی نامہ کا ترجمہ لکھوایا ہے اس کے دیباچہ میں حیدری نے محمد قادری کا ذکر کیا ہے مگر دکنی میں نہیں لکھا۔یہ ہے طوطا کہانی کی اصل‘‘۔

سطور بالا سے مفصلۂ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

۱۔قادر بخش اور ملک محمد قادری دو مختلف مصنفین نے دو طوطی نامے لکھے۔

۲۔قادر بخش کا طوطی نامہ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔

۳۔مدیر تحفہ نے ملک محمد قادری کا طوطی نامہ دیکھا ہے۔

۴۔قادر بخش اور محمد قادری کے طوطی نامے فارسی میں نہیں بلکہ دکنی میں لکھے گئے ہیں۔

۵۔حیدری نے محمد قادری کے طوطی نامہ سے طوطا کہانی لکھی ہے۔

مدیر تحفہ سے طوطا کہانی کی حقیقت کے بیان کرنے میں ایک دو نہیں بلکہ متعدد لغزشیں سرزد ہوئی ہیں۔اولاً یہ کہ قادر بخش اور محمد قادری کو دو مختلف مصنف سمجھا ہے حالانکہ ایک ہی مصنف ہے اور اس کا صحیح نام محمد قادری ہے۔ثانیاً یہ کہ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری کے دکنی طوطی نامہ کو قادر بخش کی تصنیف بتایا ہے حالانکہ اس کے دیباچہ میں مصنف کا نام بصراحت محمد قادری تحریر ہے۔ثالثاً یہ کہ محمد قادری نے طوطی نامہ دکنی میں نہیں لکھا بلکہ نخشبی کے طوطی نامہ کو فارسی میں خلاصہ کیا ہے اور اس فارسی خلاصہ کا دکنی میں ترجمہ ہوا ہے۔

محمد قادری کا طوطی نامہ سترھویں صدی عیسوی میں تصنیف ہوا ہے۔ (Rieu, B. M., P. Ms., P 752) اس میں ۳۵ حکایات ہیں اور مسٹر گلاڈوین نے اس کو انگریزی ترجمہ کے ساتھ سنہ ۱۸۰۰ ع میں کلکتہ میں چھپوایا ہے۔ اس کے دیباچہ کی فارسی عبارت یہ ہے۔

"بعد از جلس جلس ثنا و صفت پیدا کنندۂ آسمان و زمین کیفیت و حقیقت این است که داستان قصه ها و حکایات حضرت نخشبی رحمۃ اللہ علیہ که در طوطی نامه بعبارت سخت و رقیق نوشته بودند ان را برائے مفصل وبیان و از جهت معلوم شدن همه مردمان محمد قادری اصلح اللہ شانه از عبارت سلیس و آسان که مشتمل بر عبارت خطوط باشد و روزمره جواب و سوال که دولت مندان را لائق باشد نوشتۂ است"

عثمانیه یونیورسٹی لائبریری میں دکنی زبان کا جو طوطی نامه هے وہ اسی فارسی خلاصه کا ترجمه هے اور ۱۵ ربیع الاول سنه ۱۱۴۲ ھ کو تمام هوا هے۔اس میں بهی فارسی نسخه کے موافق ۳۵ حکایات هیں۔اس کے دیباچه کی عبارت یه هے—

"پچهے سیں طرح طرح صفت و ثنا پیدا کرنے والے زمین و آسمان کے کیفیت و حقیقت یو هے که داستان قصه ها و حکایات حضرت نخشبی رحمۃ اللہ علیہ کو بیچ طوطی نامے کے سات عبارت سخت و دقیق کے لکهے هیں۔اس کے تئیں مفصل و بیان وار واسطے معلوم هونے تمام لوگاں کو محمد قادری نیک کرے اللہ تعالیٰ مرتبه اونو کا بیچ عبارت سلیس و آسان کے که ملی هوئی اوپر عبارت خطاں کے هوئے و روزمره جواب و سوال که دولت منداں کے تئیں لائق هوئے لکهے هیں"

محمد قادری کے طوطی نامه کو سنه ۱۸۰۰ ع میں گلادوین نے کلکته میں شائع کیا۔اس کے ایک سال بعد ڈاکٹر گلگرسٹ کی فرمائش سے سنه ۱۸۰۱ ع میں بمقام کلکته حیدر بخش حیدری نے اس کا ترجمه اُردو میں کیا اور طوطا کهانی اس کا نام رکها چنانچه طوطا کهانی کے دیباچه میں تحریر هے—

"سید حیدر بخش متخلص حیدری شاہ جهاں آبادی تعلیم یافته مجلس خاص نواب علی ابراهیم خان بهادر مرحوم شاگرد غلام حسین خان غازی پوری دست گرفته .... صاحب والا شان جان گلگرسٹ صاحب بهادر دام اقباله کا هے۔اگرچه

تھوڑا بہت رابطہ موافق اپنے حوصلہ کے عبارت فارسی میں بھی رکھتا ہے لیکن بموجب فرمائش صاحب موصوف کے سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ھجری مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی کے حکومت میں مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے محمد قادری کے طوطی نامہ کا جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاءالدین نخشبی ہے زبان ہندی میں موافق محاورہ اُردوے معلیٰ کے عبارت سلیس و خوب و الفاظ رنگین و مرغوب میں ترجمہ کیا اور نام اس کا طوطا کہانی رکھا"۔—

بقول مدیر تحفہ کے طوطا کہانی کا جو نسخہ سنہ ۱۸۹۸ع میں مطبع محمدی بمبئی میں چھپا ہے اس کے پیشانی پر لکھا ہے کہ حیدر بخش حیدری نے اِس کو قادر بخش کے فارسی طوطی نامہ سے ترجمہ کیا۔حقیقت یہ ہے کہ طوطی نامہ کے مصنف کا نام لکھنے میں اہالیان مطبع سے غلطی ہو گئی ہے اور بجاے محمد قادری کے قادر بخش لکھہ دیا ہے—

———:o:———

مولانا عبدالحق صاحب نے سبرس پر جو مضمون لکھا ہے اس میں سنہ تصنیف کی نسبت لکھتے ہیں کہ میرے یہاں سبرس کے دو نسخے ہیں لیکن کسی میں بھی سنہ تصنیف مذکور نہیں ہے۔اس کے بعد مولانا نے اس عہد کے حالات پر نظر کر کے از روے قیاس یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ کتاب سنہ ۱۰۴۰ ھجری کے بعد لکھی گئی ہے—

مدیر تحفہ نے کتب خانہ آصفیہ کے ایک نسخہ میں کتاب کے اندر اس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۰۴۵ھجری دیکھا ہے۔اس میں اور مولوی صاحب کے قیاس میں ایسا بین فرق نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے سبرس کے عہد تصنیف پر کوئی تاریخی اثر پڑتا نظر آئے۔سچ تو یہ ہے کہ مولوی صاحب کا استخراج اس لحاظ سے قابل تحسین ہے کہ انھوں نے کسی اندرونی شہادت سے فائدہ حاصل کئے بغیر محض واقعات کی بنا پر قیاس سے کام لے کر اس کا ایسا عہد تصنیف بیان کیا

جو خود مصنف کے بیان سے مغائر نہیں ہے۔ سنہ تصنیف کی بحث کے بعد مدیر تحفہ نے لکھا ہے کہ —

"رسالہ اُردو میں سبرس کی عبارت کا جو نمونہ دیا ہے ان نسخوں* سے مقابلہ کرنے پر جا بجا فرق نظر آتا ہے"

کسی کتاب کے دو قلمی نسخوں کو باہم مقابلہ کریں تو اُن میں ضرور فرق نظر آتا ہے۔ یہ کوئی نئی اور قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ یورپ میں عربی۔ فارسی کی جو کتابیں چھپتی ہیں اُن کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قلمی نسخوں کے اختلافات لفظوں تک محدود نہیں رہے بلکہ بڑی بڑی کئی کئی سطروں کی عبارتیں بھی ان میں ایک دوسرے سے مغائر نظر آتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ عربی فارسی کی جب کسی کتاب کو چھاپتے ہیں تو اس کے آخر میں اختلافات نسخہ کی فہرست بھی شامل کر دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال شیخ فریدالدین عطار کا تذکرۃالاولیا ہے جس کو پروفیسر نکلسن نے شایع کیا ہے اور اس کے آخر میں نصف کتاب کے قریب قریب اختلافات نسخ کی فہرست شامل ہے۔ یہی حال لباب الالباب کا ہے جس کو پروفیسر براؤن نے شایع کیا ہے۔ اس کی پہلی جلد ۳۳۲ صفحات پر تمام ہوئی ہے اور اس کے آخر میں تین نسخوں کے اختلافات ۷۸ صفحوں پر بتائے گئے ہیں —

مدیر تحفہ لکھتے ہیں کہ

"مولانا نے سبرس کے ماخذ اور اس کے مصنف سے کوئی بحث نہیں کی ہے کتب خانہ آصفیہ کے مکمل نسخے کے خاتمہ پر لکھا ہے "الحمدالله والمنه بحق حبیبه کتاب سبرس تصلیف حضرت وجهه الدین گجراتی رحمة الله علیه بتاریخ شانزدهم روز سه شلبه شهر صفرالمظفر سله ۱۲۹۵ هجری باختتام رسید"..................

---

* ان نسخوں سے کتب خانہ آصفیہ کے دو نسخے اور آغا حیدر حسن کا ایک نسخہ مراد ہے —

مولانا سبرس کو تصوف کی کتاب نہیں سمجھتے ہیں۔ کتب خانہ آصفیہ کی فہرست جلد اول میں سبرس فن تصوف نمبر ۱۹۵ و ۶۳۲ پر رکھی گئی ہے اور مصنف کا نام وجہہ الدین لکھا گیا ہے"۔

مدیر تحفہ کو معلوم ہو کہ کتب خانۂ آصفیہ کے مکمل نسخہ میں مصنف کا نام حضرت وجہہ الدین گجراتی نہیں ہے بلکہ صرف حضرت وجہہ الدین رحمۃاللہ علیہ لکھا ہوا ہے البتہ کتب خانۂ آصفیہ کی فہرست میں صفحہ ۵۱۲ پر سبرس کے مصنف کا نام صرف وجہہ الدین نہیں بلکہ وجہہ الدین گجراتی لکھا گیا ہے۔

مدیر تحفہ نے مشکوٰۃالنبوت سے اخذ کرکے حضرت شاہ وجہہ الدین گجراتی کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ آپ احمدآباد میں سنہ ۹۰۹ ھ میں پیدا ہوئے۔ شیخ محمد غوث گوالیری کے خلیفہ تھے۔ سلخ محرم ۹۹۸ ہجری کو انتقال ہوا۔ آپ کی تصنیفات سے کئی کتابیں مشہور ہیں مثلاً رسالہ حقیقت محمدیہ و شرح جام جہاں نما وغیرہ۔

سبرس ۱۰۴۵ ہجری میں تصنیف ہوئی ہے اور اِس کے تصنیف ہونے سے سینتالیس سال پہلے ۹۹۸ ہجری میں حضرت وجہہ الدین گجراتی نے انتقال فرمایا ہے۔ ایسی حالت میں سبرس کو حضرت وجہہ الدین گجراتی کی تصنیف سمجھنا ایک صاف و صریح غلطی ہے۔ مدیر تحفہ نے سبرس کے خاتمے اور فہرست کتب خانۂ آصفیہ کے حوالہ سے مصنف سبرس کا نام وجہہ الدین یا وجہہ الدین گجراتی بیان کرنے کے بعد اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے۔

"ان چیزوں پر غور و خوض کرنے سے سبرس کے ماخذ اور اس کے مصنف کے متعلق ممکن ہے کہ ہم کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں"۔

لیکن ہماری رائے میں ایک صاف و صریح غلطی پر غور و خوض کرنے کے بعد کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی اُمید کرنا ایک فعل عبث اور لاحاصل

کوشش ہے۔

مولانا نے اپنے مضمون میں سبرس کے مصنف کا نام وجہی لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں گزرا ہے اور غواصی کا ہمعصر ہے۔ مدیر تحفہ نے اس کو ناکافی سمجھا اور اس میں جو خامی رہ گئی ہے اسے پورا کرنے کا ارادہ کیا۔ نہایت تعجب ہے کہ ان سے مولانا کی تحریر پر ایک حرف کا بھی اضافہ نہو سکا اور جو دوسروں سے نقل کیا تو وہ بھی غلط اور بے سروپا۔

کتب خانۂ آصفیہ کی فہرست میں سبرس کا فن تصوف میں رکھا جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ کتاب حقیقت میں تصوف کی ہے۔ کتب خانۂ آصفیہ کی فہرست میں ایسی بہت سی کتابیں ہیں جو غلطی سے فن غیر متعلق میں درج ہوگئی ہیں۔ عاقل خاں رازی کی پدماوت جس میں مصنف نے ہندوستان کے دو عاشق و معشوق منوہر و مدمالتی کا قصہ لکھا ہے (Ethe, I.O.P.Mss. 1634) کتب خانۂ آصفیہ کی فہرست میں فن تصوف نمبر ۱۸۷/۲ پر درج ہے (ملاحظہ ہو فہرست جلد اول صفحہ ۴۰۶) ظاہر ہے کہ یہ ایک فسانہ ہے اور اس کو تصوف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن غلطی سے یہاں درج ہوگیا ہے۔ یہی کیفیت سبرس کی ہے۔ اس میں اگرچیکہ مصنف نے اخلاق و تصوف کی متعدد باتیں ضمناً بیان کی ہیں لیکن مصنف نے ان باتوں کو مختلف عنوانات کے تحت میں نہیں لکھا ہے جیسا کہ بالعموم فنون کی کتابوں میں ہوتا ہے۔ بر خلاف اس کے سبرس کی بنیاد ایک فسانہ پر رکھی ہے اور اس اعتبار سے اس کتاب کو تصوف کی کتاب کے بجائے فسانہ کی کتاب سمجھنا ہی زیادہ مناسب ہے۔

مدیر تحفہ لکھتے ہیں کہ

"مولانا سب رس کے ضمن میں غواصی کی مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کا سنہ ۱۰۳۵ اور طوطی نامہ کا سنہ ۱۰۲۷ بتاتے ہیں۔ غواصی خود سیف الملوک

و بدیع الجمال کا سن تصنیف اس طرح لکھتے ہیں۔

برس یک ہزار اور ستاویس میں کیا ختم یو نظم دن تیس میں

مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غواصی نے اس سے پہلے کوئی مثنوی طوطی نامہ وغیرہ نہیں لکھی۔

طوطی نامہ کا سنہ ۱۰۲۷ ھ دراصل سیف الملوک و بدیع الجمال کا سنہ ہے اور طوطی نامہ کا سن شاید ۱۰۳۵ ھجری ہو''

مدیر تحفہ نے سطور بالا میں جس شعر کا حوالہ دیا ہے وہ سیف الملوک و بدیع الجمال کے اس نسخہ سے منقول ہے جو سنہ ۱۲۹۰ ھ میں چھپا ہے ملاحظہ ہو نسخۂ مذکور کا صفحہ ۱۱۳ سطر ۱۹ اور اس نسخہ میں کثرت سے غلطیاں ہیں لیکن متعدد قلمی نسخوں میں جو ہماری نظر سے گزرے ہیں شعر مذکور اس طرح تحریر ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مثنوی جیسا کہ مولانا نے لکھا ہے سنہ ۱۰۳۵ ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔

برس یک ہزار ہور پنج تیس میں

کیا ختم یو نظم دن تیس میں

اس میں شک نہیں کہ طوطی نامہ کا سنہ بیان کرنے میں ایڈیٹر اُردو سے غلطی ہوئی ہے لیکن مدیر تحفہ نے جس سن کی نسبت گمان کیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ بلکہ غواصی نے طوطی نامہ میں بیان کیا ہے کہ یہ مثنوی سنہ ۱۰۴۹ ھ میں ختم ہوئی۔

برس یک ہزار ہور چالیس پہ نو

ہوئے تھے یو موتیاں پوریاں ہوں نو

سنہ کے متعلق ایڈیٹر اُردو کی یہ غلطی محض اتفاقی ہے کیوں کہ یہ شعر ہم نے خود انہیں کے نسخہ سے نقل کیا ہے۔

"سبرس عنقریب انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہونے والی ہے اس

لحاظ سے ہماری رائے ہے کہ ان فروگزاشتوں پر ایک نظر ڈال لیجائے اور انجمن ترقی اردو اگر اپنی مصلحت کے خلاف نہ سمجھے تو سبرس کو مسٹر آغا حیدر حسین دہلوی سے اڈیٹ کرا کے شایع کرے تو ممکن ہے کہ کوئی ایسی فروگزاشت نہ ہوسکے"

مدیر تحفہ نے سب رس کی اڈیٹری کے لئے مسٹر آغا حیدر حسن کو تجویز کیا ہے جو دہلی کے باشندے ہیں۔ اُردوئے معلی کی زبان ان کی مادری زبان ہے اور انہوں نے حیدرآباد آنے سے پہلے شاید ہی کسی وقت دکنی کا کوئی لفظ سنا ہوگا۔بجائے ان کے اگر مدیر تحفہ کرنول۔گوگی۔شاہنور۔یا بیجاپور کے کسی باشندے کا نام پیش کرتے تو زیادہ موزوں ہوتا۔کیوں کہ یہاں کے باشندوں کی مادری زبان دکنی ہے اور یہ لوگ اس وقت تک ویسی ہی دکنی بولتے ہیں جیسی کہ غواصی۔نصرتی۔ابن نشاطی اور وجہی کی تصنیفات کی ہے اور ان تصنیفات کو صحیح طور پر پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کی ہم سے زیادہ قابلیت رکھتے ہیں۔

(س۔م۔ن)
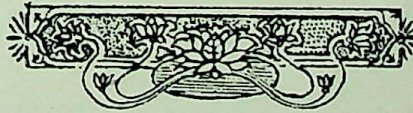
مجالس العشاق

دسمبر سنہ ۱۹۲۴ ع کے معارف میں کتب خانہ عبدالرحیم خان خانان کے متعلق مولوی حافظ نظیر احمد صاحب کا جو مضمون شایع ہوا ہے اُس میں کتاب مجالس العشاق کی نسبت لکھا ہے کہ یہ کتاب سلطان حسین مرزا بایقرا کی تصنیف ہے (معارف جلد ۱۴ نمبر ۶ صفحہ ۴۱۹) سلطان حسین سنہ ۸۷۳ ہجری سے سنہ ۹۱۱ ہجری تک خراسان میں برسر حکومت رہا ہے۔یورپ کے اکثر متشرقین مثلاً چارلس ریو۔گستاوفلوگل وغیرہ نے بھی سلطان حسین ہی کو اس کتاب کا مصنف بتایا ہے اور خود کتاب مذکور کے دیباچہ میں بھی مصنف کا نام سلطان حسین تحریر ہے —

"محرر این انشا خاک راہ اولیا سلطان حسین ابن سلطان منصور ابن بایقرا (صح بایسنقر) ابن عمر شیخ ابن تیمور گورگاں"

لیکن حقیقت میں یہ کتاب سلطان حسین مرزا کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اسے میر کمال الدین حسین گازرگی نے سلطان حسین کے نام سے تصنیف کیا ہے۔ چنانچہ فردوس مکانی ظہیرالدین محمد بابر بادشاہ (ولادت سنہ ۸۸۸ ہجری وفات سنہ ۹۳۷ ہجری) نے جو سلطان حسین کا معاصر ہے اپنی آٹوبیاگرفی میں ایک مقام پر اس کتاب کے مصنف کی نسبت بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ کتاب حقیقت میں امیر کمال الدین حسین گازرگی کی تصنیف ہے۔چنانچہ یہ بیان بابر کی اصل ترکی آٹو بیاگرفی جو بابر نامہ کے نام سے مشہور ہے صفحات

مندرجہ ذیل پر موجود ہے —

(۱) اِلمنسکی Ilminsky ایڈیشن-طبع قازان سنہ ۱۸۵۷ ع صفحہ ۲۲۱

(۲) بیورج Beveridge ایڈیشن-جو لیڈن کے مطبع بریل میں گب میموریل Gibb Memorial کی طرف سے سنہ ۱۹۰۵ ع میں فوٹو افکو گرافی میں چھپا ہے-ورق ۱۷۶ رخ اول —

ترکی زبان چونکہ ہمارے ملک میں بہت کم سمجھی جاتی ہے اس لئے ہم نے اس کے ترکی اقتباس کو قلم انداز کر دیا-لیکن بابر نامہ کے فارسی ترجمہ کی عبارت ذیل میں نقل کرتے ہیں-اس ترجمہ کو عبدالرحیم خان خانان نے سنہ ۹۹۸ ہجری میں شہنشاہ اکبر کے حکم سے لکھا ہے اور عام طور پر واقعات بابری یا توزک بابری کے نام سے مشہور ہے —

"دیگر کمال الدین حسین گازرگی بود-اگرچہ صوفی بنود-متصوف بود .... یک تصنیفی دارد مجالس العشاق نام-بنام سلطان حسین مرزا بستہ نوشتہ است-بسیار سست و اکثری دروغ و بے مزہ و بے ادبانہ حرفہا نوشتہ-از بعضے سخنان بوی کفر می شنوند-چنانچہ خیلے از انبیا و بسیارے از اولیا را بعشق مجازی منسوب ساختہ از برائے ہر کدام معشوقی و محبوبی پیدا کردہ-این عجب کورانہ امری ست کہ در دیباچہ سلطان حسین مرزا تصنیف و تحریر من است نوشتہ"

یہ ایک سب سے بڑی اور زبردست شہادت ہے اس بات کی کہ یہ کتاب سلطان حسین کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اسے میر کمال الدین حسین گازرگی نے سلطان حسین کے نام سے لکھا ہے-امین احمد رازی نے بھی اپنی کتاب ہفت اقلیم میں (جو سنہ ۱۰۰۲ ہجری میں بمقام آگرہ تصنیف ہوئی ہے) اس کتاب کو میر کمال الدین حسین کی تصنیف بیان کیا ہے اور اقلیم سوم میں مشاہیر طبس کا تذکرہ بیان کرتے ہوئے امیر کمال الدین حسین کے حالات میں لکھا ہے —

"شرح منازل السائرین و مجالس العشاق در سلک مولفات امیر کمال الدین انتظام دارد"

میر کمال الدین حسین کے حالات خواجہ غیاث الدین خوندمیر نے اپنی مشہور تاریخ حبیب السیر میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں اور یہی حالات لفظ بلفظ ملحقات روضۃ الصفا میں بھی مذکور ہیں۔ جس کا اقتباس کسی قدر اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(واضح ہو کہ میرخوند محمد بن خاوند شاہ بلخی المتوفی سنہ ۹۰۳ ہجری نے روضۃ الصفا کی صرف چھ جلدیں لکھی ہیں۔ ساتویں جلد جس میں سلطان حسین مرزا کے حالات ہیں حبیب السیر سے نقل کرکے بعد میں بطور ملحقات کے اس میں اضافہ کر دی گئی ہے)۔

امیر کمال الدین حسین ابیوردی در سلک فضلائے سادات خراسان منتظم بود۔ و در عنفوان اوان جوانی از ابی ورد به هرات آمد و به تحصیل علوم مشغول گشت۔ و در آن اثنا به مجلس شریف کیچک مرزا افتاد۔ و شاہزادہ او را مصاحب خود ساخته ابواب احسان بر روے روز گارش بکشاد۔ اما در وقتیکه مرزا کیچک عزیمت حج فرمود امیر حسین باوی موافقت نه نمود و بعد از رفتن شاہزادہ از توقف پشیمان شدہ از عقبش شتافت لیکن بحسب تقدیر ملک قدیر دران سفر بلکه دیگر بخدمتش نتوانست رسید۔ و چون حج اسلام گزاردہ مراجعت کرد و در تبریز بسعادت ملازمت سلطان یعقوب مرزا اختصاص یافت و چند سال دراں مملکت اوقات گزرانیدہ بوطن مالوف باز آمد و بخدمت امیر علی شیر پیوسته ملحوظ عین التفات شد۔ در اواخر اوقات حیات خاقان منصور (مراد از سلطان حسین مرزا) بمبلغ شتافته سلطان بدیع الزمان مرزا اورا بشحنگی آستانه علیه شاهیه نصب کرد۔ و در سنه ۹۰۸ ثمان و تسعمائة آن منصب را بامر صدارت مبدل ساخت و در سنه ۹۱۰ عشر

وتسعماة که بدیع الزمان مرزا در هراة بود امیر حسین از صدارت استعفا نموده بابی ورد رفت ویک دو سال بفراغت گزرانیده در سنه ۹۱۴ اربع عشر وتسعماة محمد خان شیبانی اورا برسم رسالت متوجه درگاه عالم پناه نواب کامیاب شاهی (مراد از شاه اسمعیل صفوی) گردانید- و امیر حسین بسعادت ملازمت آستان ملایک آشیان مشرف گشته مشمول انعام و احسان شده مراجعت نمود- و در وطن مالوت و مسکن معهود یعنی ولایت ابی ورد رحل اقامت انداخت و در سنه ۹۲۰ عشرین وتسعماة عالم آخرت را منزل ساخت واز جمله معمیات آنجناب این معما باسم شاه زمان بر خاطر بود ثبت افتاد—

شاه بازی که طرح عدل افگند نام خود در نگیں دولت کند

(حبیب السیر جلد سوم جزو سیم صفحه ۳۴۴-روضة الصفا جلد هفتم طبع بمبئی سنه ۱۲۷۱ صفحه ۷۹)

حکیم سید شمس الله قادری

تبصرے

ادب

تاریخ و سیرت

اخلاق و تعلیم

مذہب

متفرق

اُردو کے جدید رسالے

ادب

مکتوبات حالی

(مرتبہ جناب خواجہ سجاد حسین صاحب بی اے)

دنیا میں بڑے آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کا ہم ادب و احترام کرتے ہیں دوسرے وہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ ادب ہم اُن الوالعزم اور عالی حوصلہ مدبروں اور وطن پرستوں اور باکمال حکیموں اور ادیبوں کا کرتے ہیں جن کے حیرت انگیز جد و جہد۔ قربانیوں اور عظیم الشان کاموں اور تدبیروں نے اور جن کے علم و کلام نے عالم کو فیض پہنچایا اور روشن سورج کی طرح دنیا سے تاریکی کو مٹایا۔ محبت ہم اُن سے کرتے ہیں جن کی پاک سیرت۔ خوش اطواری اور خوش اخلاقی دل کے موہنے میں وہی کام کرتی ہے جو چودھویں رات کی چاندنی۔ اُن کے پاس سے جو اُٹھا کچھہ لیکر اُٹھا اور اُن کے پاس جو گیا وہ کچھہ بن کر آیا۔ مولانا حالی اُن پاک نفوس میں سے ہیں جن کا ہم ادب بھی کرتے ہیں اور اُن سے محبت بھی۔ اُن کے کلام نے اُردو شاعری میں ایک انقلاب پیدا کردیا اور یہ اسی کا طفیل ہے کہ آج اُردو شاعری کا قدم ترقی کی طرف نظر آتا ہے اور اسی طرح ان کی متین اور جچی تلی نثر اور تنقید نے اُردو ادب میں ایسا بے بہا اضافہ کیا ہے کہ جس کا اعتراف ہر صاحب ذوق کرتا ہے۔ یہ چیزیں ہمارے دل میں اُن کا ادب و احترام پیدا کرتی ہیں۔ دوسری طرف اُن کی سیرت ہے۔ اُن کے پاکیزہ اخلاق اور اطوار۔ اُن کی دلسوزی اور ہمدردی کا دلوں پر اثر پڑتا تھا۔ وہ کوئی بہت بڑے جادو بیان یا خوش تقریر نہ تھے مگر اُن کی باتوں میں کچھہ ایسا خلوص تھا کہ لوگوں کے دل خود بخود اُن کی طرف کھچ جاتے تھے۔ وہ کبھی کسی کی مذمت یا برائی سے اپنی

زبان آلودہ نہ کرتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی نرمی اور خوش اسلوبی سے روکتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے اُن پر سخت اور بیجا تنقیدیں کیں اُن کو بھی اُنہوں نے سراہا۔ اگر کوئی شخص ایسا کام کرتا اور کوئی ایسی چیز لکھتا جس میں ذرا بھی خوبی کا پہلو ہوتا تو اُس کی دل افزائی فرماتے اور خوش ہو کر تعریف کرتے تھے۔ ہمدردی کا یہ حال تھا کہ دوسرے کا درد دیکھہ کر خود تڑپنے لگتے تھے۔ باوجود ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب اور شاعر ہونے کے مزاج میں بے حد انکسار اور فروتنی تھی۔ یہ وہ خوبیاں تھیں جو دلوں میں گھر کر لیتی تھیں اور ان کی طرف سے محبت پیدا کرتی تھیں۔ اگرچہ خطوں کے اس مجموعے میں جواب چھپ کر شایع ہوا ہے زیادہ تر خط ایسے ہیں جو عزیز و اقارب کے نام ہیں اور جن میں روز مرہ کی معمولی باتیں آے دن کے آلام و افکار۔ اپنی اور دوسروں کی بیماری اور مصیبت کا ذکر ہے مگر ان میں بھی ایک بات پائی جاتی ہے۔ علاوہ ان کے بہت سے خط احباب اور ہم عصروں کے نام ایسے بھی ہیں جن میں اُن کے دلی خیالات اور اُن محاسن کا پتہ لگتا ہے جن کا ذکر ہم نے کیا ہے —

ان میں سے اکثر خط اُس وقت کے ہیں جب وہ سر سید مرحوم کی سوانح عمری لکھہ رہے تھے۔ اس قابل قدر اور بے مثل کتاب کے لکھنے میں اُنہوں نے بے حد محنت اور جانفشانی اور کاوش سے کام کیا اور باوجود اپنی بیماری۔ خانگی پریشانیوں اور جھگڑوں اور ایک نواسے کے لاعلاج مرض کے جس نے ان کی زندگی تلخ کردی تھی وہ برابر اسے لپٹتے رہے اور کئی سال تک خون جگر کھانے کے بعد اسے تمام کیا۔ جو کتاب اس قدر دماغ سوزی۔ زحمت اور مسلسل کوشش اور جگر کاوی کے بعد لکھی گئے تھی جب وہ شایع ہوئی اور اُن لوگوں کی طرف سے بے اعتنائی ظاہر ہوئی۔ جن سے خاص طور پر یہ توقع تھی کہ وہ اس کی قدر کریں گے اور جو سر سید مرحوم کے فدائی۔ ساتھی اور ہمدرد تھے تو معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو اس کا قلق ہوا۔ چنانچہ وہ ایک صاحب کو جو نواح علیگدہ کے رئیس اور روشن خیال صاحب ذوق اور صاحب علم ہیں یہ لکھتے ہیں کہ "ڈیڑہ مہینے سے زیادہ عرصہ ہو چکا کہ حیات جاوید کی جلدیں تینوں قسم کی ڈیوتی شاپ میں پہنچ گئیں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ نے ضرور وہاں سے منگوائی ہوں گی کیونکہ اگر مصنف قابل وقعت نہ تھا تو ہیرو بلا شبہ ایسا تھا کہ اس کی بائیوگریفی دیکھنے کا خاص کر آپ جیسے لوگوں کو ضرور مشتاق ہونا چاہئے تھا مگر جہاں تک خیال کیا جاتا ہے مصنف کی

بے وقعتی نے هیرو کی بھی قدر گھٹا دی ھے۔جن لوگوں سے یہ اُمید تھی کہ اس کتاب کے منگوانے میں ایک دوسرے پر سبقت کریں گے ان کی طرت سے سرد مہری کے سوا میں نے اب تک کچھہ نہیں دیکھا۔اگرچہ اس قلیل عرصہ میں کتابیں توقع سے زیادہ فروخت ہو گئی ہیں مگر ایسی قدردانی سے وهی شخص خوش هو سکتا ھے جو تجارت کے سوا تصنیف و تالیف کا اور کوئی مقصد خیال نہیں کرتا۔بلا شبہ میں نے کسی سے اشتہار یا ریویو وغیرہ لکھنے کی خواهش ظاهر نہیں کی مگر میرا خواهش نہ کرنا اس بات کا هرگز مقتضی نہ تھا کہ سر سید کا کوئی دوست اس کتاب کا بالکل نوتس نہ لے۔اور اخباروں کو جانے دیجئے علیگدہ انستیتیوت گزت جس کو سر سید کی یادگار کہا جاتا ھے اور جس کا اهتمام محمدن کالج کے آنریری سکریٹری اور سر سید کے جانشین اور اُن کے زبدۂ احباب کے هاتھہ میں ھے آج تک حیات جاوید کی نسبت اس میں ایک حرت نہیں لکھا گیا۔اگرچہ میں صدق دل سے اقرار کرتا هوں کہ سر سید کی لائف جیسی کہ چاهئے تھی ویسی مجھہ سے نہیں لکھی گئی۔لیکن اسی کے ساتھہ میں یہ بھی کہتا هوں کہ میں نے باوجود اپنی ناقابلیت کے اس بار گراں کو اپنے ذمہ لیکر سر سید کے تمام اصحاب اور حواریوں کو ایک فرض کفایہ سے سبکدوش کیا ھے اور اس لئے میں اپنے زعم میں یہ سمجھے هوئے تھا کہ سر سید کے احباب اگر اس تصنیف کو پسند نہ کریں گے تو اس کی اشاعت میں ضرور مدد دیں گے۔مگر آج تک کسی نے اس کی بات بھی نہ پوچھی بلکہ بجاے امداد کے بعض اصحاب متوقع هیں کہ اُن کی خدمت میں ایک ایک کاپی هدیۃً پیش کی جائے............صاحب نے سر سید کی زندگی میں وعدہ کیا تھا کہ پانسو روپیہ کی کتابیں خرید کر کالج کو دوں گا۔مگر میں سر سید کو اور اپنے تئیں بڑا خوش قسمت سمجھوں گا جب یہ سنوں گا کہ اُنھوں نے کوئی کاپی ڈیوتی سے خرید فرمائی ھے اور اس کو مطالعہ کے لائق سمجھا ھے۔آپ یقین جانئے کہ میں اس زمانہ کی لٹریری ترقی کے آگے ایسے لوگوں کی تحریرات کو جو میری طرح محض اُردو فارسی کے مرد میداں هیں لاشے محض جانتا هوں۔مگر مکڑی جو اپنا جالا پورنے میں منتہاے طاقت صرت کرتی ھے وہ اسی کو حریر و اطلس بلکہ ان سے بھی زیادہ گراں قدر تصور کرتی ھے"

یہ مولانا کے انتہائی رنج اور صدمے کا اظہار ھے ورنہ وہ ایسے نیک مزاج اور شریف النفس تھے کہ تحریر میں تو کیا زبان پر بھی کسی کی شکایت نہیں آتی تھی اور یہ بھی اُنھوں نے ایک خانگی خط میں لکھا ھے اور وہ بھی ایک

ایسے صاحب کو جو اُن کے اور اچھی کتابوں کے قدرداں تھے اور جن سے ایک حد تک بے تکلفی بھی تھی اور پھر وہ ایک عام حالت کا نقشہ ھے جس کا بیان کرنا کچھھ ایسا معیوب نہیں ھوسکتا۔ اگرچہ اس خط سے رنج اور صدمہ کا اظہار ضرور ھوتا ھے اور ایک طرح کی شکایت بھی پائی جاتی ھے لیکن دیکھا جائے تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں ھے جو کسی کے لئے دل شکن ھو۔ اگر اُن کے بعض نامور ھم عصر مصنفین کی تحریروں یا خطوں سے مقابلہ کیا جائے جو اُنہوں نے ایسے موقعوں پر لکھی ھیں تو یہ تحریر کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس سے ظاھر ھے کہ جس شخص کے صدمہ اور رنج کی انتہا یہ ھو وہ کیسا پاک سیرت ھوگا۔ حقیقت یہ ھے کہ وہ سرسید کی دل سے قدر کرتے تھے اور سرسید کو مرے بھی تھوڑا ھی عرصہ ھوا تھا جب انہوں نے دیکھا کہ ابھی سے اُن لوگوں کا جو سید کی محبت اور جاں نثاری کا دم بھرتے تھے یہ حال ھے تو انہیں بہت شاق گزرا۔ گھاؤ تازہ تھا۔ پھوٹ پڑے—

اس خط میں ایک دوسری حقیقت کو بھی آشکارا کردیا ھے جو بہت ھی قابل افسوس ھے۔ ھمارے ھاں کے متمول اور صاحب ثروت لوگ کسی کتاب کی قدر کرنا تو کجا خرید کر پڑھنا بھی نہیں جانتے اور اس بات کے متوقع رہتے ھیں کہ مصنف اُن کی خدمت میں اس کا نسخہ ھدیۃً پیش کرے۔ یہی وجہ ھے کہ ھمارے ھاں کی بہتر سے بہتر کتاب بھی اتنی نہیں بکتی جتنی دوسرے ممالک میں معمولی درجے کی کتابیں فروخت ھوجاتی ھیں۔ سرسید کے احباب کی اِس بے اعتنائی کا اُن کے دل پر اس قدر اثر تھا کہ انہیں تاریخوں میں ایک خط میں جو اُنہوں نے اپنے ایک نیازمند کے نام لکھا ھے اُس دکھڑے کو پھر رویا ھے۔ چونکہ یہ ایسی بپتا ھے جس میں ھم سب مبتلا ھیں اس لئے اس خط کے ایک حصے کے نقل کرنے کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں معلوم ھوتی—

"میں ھرگزیہ خیال نہیں کرتا کہ میں نے اس عجیب و غریب شخص کی بائیوگریفی لکھنے کا پورا پورا حق ادا کردیا ھے بلکہ مجھے اپنی کمزوریاں اور لغزشیں بخوبی معلوم ھیں اور میں علی الاعلان اقرار کرتا ھوں کہ مجھ سے اس بائیوگرافی کا حق ادا ھو نہیں ھوسکا۔ لیکن میں نے اپنی طرف سے کوشش کرنے میں کمی نہیں کی اور چھھ برس تک اس کام کے سوا دوسری طرف متوجہ نہیں ھوا۔ کسی متنفس نے قلم یا درم سے براہ راست اس کام میں مجھے مدد نہیں دی (الا ماشاءاللہ) پس اگرچہ یہ کام فی نفسہ کچھھ قدر کے لائق نہ ھو مگر اس لحاظ سے کہ میں نے اس کے سرانجام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف

کی ہے ضرور توجہ کے لائق ہے........ ... میں اس موقع پر آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ جب میں نے مسدس مد و جزر اسلام کا پہلا اڈیشن نکالا اور اس کی ایک جلد سر سید مرحوم کے پاس بھیجی تو بغیر اس کے کہ میں نے اس مرحوم سے کوئی درخواست کی ہو فوراً مجھ سے پوچھا کی آپ نے اس کی کتنی جلدیں چھپوائی ہیں۔ میں نے جواب لکھ بھیجا۔ اُنہوں نے اُسی وقت ایک فہرست اپنے احباب کی مجھے لکھ بھیجی کہ اتنی جلدیں فلاں دوست کو اور اتنی فلاں کو اور اتنی وہاں اور اتنی وہاں بھیج دو اور اپنے دوستوں کو لکھ بھیجا کہ کتابیں پہنچتے ہی قیمت مصنف کے پاس بھیج دیجئے۔ چنانچہ مہینے ڈیڑھ مہینے میں جس قدر جلدیں چھپوائی تھیں سب فروخت ہو گئیں اور دوسرا اڈیشن چھپوانے کی ضرورت ہوئی۔ افسوس ہے کہ یہ خیالات وہ شخص اپنے ساتھ لے گیا۔ اب اُن کے بڑے بڑے ذی مقدور دوست اس بات کے متوقع ہیں کہ اُن کی جناب میں کتابیں مفت نذر کی جائیں۔ بعضے قیمت بہت گراں بتاتے ہیں اور یہ تو کسی سے بھی اُمید نہیں کہ مصنف کی محنت کی کچھ داد دی جائے یا کچھ قدر کی جائے—

سوختیم و سوزش ما بر کسے ظاہر نشد
چوں چراغان شب مہتاب بے جا سوختم"

یہ خط بہت پر درد ہے۔ خط کیا ہے ہماری قوم کی ناقدردانی کا مرقع ہے۔ اگرچہ اس خط کو لکھے پورے چوبیس برس ہوئے ہیں اور ملک کے حالات میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوگیا ہے لیکن علمی قدردانی میں کچھ انیس بیس ہی کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ "جس چیز کی خریداری کا مدار زیادہ تر مسلمانوں پر ہوگا اس کا رونق اور فروغ پانا معلوم"

علی گڈھ کالج اور ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انہیں کمال ہمدردی تھی ان معاملات میں قلمے۔ درمے۔ قدمے ہر طرح کی مدد کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ ان کی تائید اور ہمدردی میں ایسی بے مثل اور بیش بہا نظمیں لکھی ہیں کہ اُن کی کوئی قیمت نہیں ہوسکتی۔ اُن کا ایک ایک شعر ہزاروں اور لاکھوں روپئے کے چندے پر بھاری ہے۔ ان خطوں میں بھی کالج اور کانفرنس کا جا بجا ذکر آتا ہے اور جو کچھ اُن سے ہوسکتا ہے اس کے کرنے میں کبھی دریغ نہیں کرتے۔ خود شریک ہوتے ہیں۔ دوسروں کو شرکت پر آمادہ کرتے ہیں۔ چندے کرتے ہیں۔ رائے دیتے ہیں۔ دوسروں کو رائے دینے اور کام

کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔اس کہ وجہ یہ ہے کہ انہیں مسلمانوں کی تعلیم سے بے حد شغف تھا اور اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ بغیر تعلیم کے یہ قوم کبھی نہیں پنپنے کی۔اپنے وطن پانی پت میں انہوں نے تعیلم کی بہت کچھہ اشاعت کی۔اپنے خاندان والوں کے سوا دوسروں کو بھی۔تعلیم کی طرف متوجہ کیا اور اُن کے لئے آسانیاں پیدا کیں اور ہر قسم کی مدد دی۔پانی پت میں ایک اچھا کتب خانہ بھی قائم کیا—

اِن خطوں سے مولانا کی بعض عادتوں اور خصلتوں کا بھی پتہ چلتا ہے اور جو لوگ اُن سے ذاتی طور پر واقف نہیں وہ بھی انہیں پڑھ کر بہت آسانی سے سمجھہ سکتے ہیں کہ اُن میں کس قدر ہمدردی اور شفقت تھی۔جب وہ اپنے کسی عزیز یا دوست کو دیکھتے تھے کہ اس سے کچھہ لغزش ہو گئی ہے یا کسی معاملے میں ضرورت سے زیادہ سخت ہے تو وہ اس قدر نرمی اور محبت سے سمجھاتے تھے یا اُس کا پیرایہ ایسا اختیار کرتے تھے کہ سننے والے کو کبھی برا نہیں معلوم ہوتا تھا بلکہ اُن کے کہنے کا اثر ہوتا تھا۔مثلاً وہ اپنے ایک دوست کو اُن کے فرزند کے متعلق لکھتے ہیں—

" معلوم نہیں کہ انہوں نے میرے عرض کرنے پر کوئی مشغلہ اختیار کیا یا نہیں۔اُن کو خدا تعالیٰ نے ایسی لیاقت دی ہے کہ ملک و قوم کو بہت کچھہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور چونکہ عنایت الٰہی سے تلاش معاش کی ضرورت نہیں ہے اس لئے اُن کے علمی مشغلوں میں کوئی چیز مزاحم نہیں ہوسکتی۔میرے نزدیک صرف کتابوں اور اخباروں کا مطالعہ کرنا اور کوئی علمی کام نہ کرنا اپنے علم کی نا قدر دانی اور اپنی قیمتی زندگی کو رائگاں کھونا ہے اس موقع پر میں اپنی ذیل کی رباعی لکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ عزیز موصوف بھی اس کو پڑھیں اور اگر وہ در حقیقت سودیشی تحریک کو دل سے پسند کرتے ہیں تو اس رباعی پر عمل کریں۔رباعی یہ ہے—

یارو نہیں وقت عیش و آرام کا یہ
موقع ہے اخیر فکر انجام کا یہ
بس جب وطن کا جپ چکے نام بہت
اب کام کرو کہ وقت ہے کام کا یہ"

مولانا کا ایک نواسہ ہے جو ایک لا علاج مرض میں مبتلا تھا اور جوں جوں اس کے دورے بڑھتے جاتے تھے اس کا مزاج نازک ہوتا جاتا تھا۔مولانا اس کی اس طرح ناز برداری کرتے تھے کہ ماں باپ بھی نہیں کرسکتے۔دنیا بھر کا کوئی

علاج ایسا نہ تھا جو انہوں نے نہ کیا ہو ڈاکٹروں اور حکیموں کا تو کیا ذکر ہے
اُن میں سے تو شاید ہی کوئی چھوٹتا ہو اگر کسی اتائی کو بھی سن پاتے ہیں
کہ وہ اس بیماری کا علاج کرتا ہے تو وہاں پہنچتے ہیں اگر کسی عامل کو سن
پایا تو اس کے پاس دوڑے پھرتے ہیں۔کسی دوست نے کوئی نسخہ بتا دیا تو
اس پر عمل کرنے پر آمادہ ہیں۔غرض۔اس کی وجہ سے مولانا کی زندگی تلخ
تھی۔وہ ایک بار اپنے چچا کے ہاں جاتا ہے۔اُس وقت مولانا نے اُسے خط لکھا ہے
جس میں اُنہوں نے ددھیال اور ننھیال والوں کے برتاو کا فرق بتایا ہے اور
پھر کس کس طرح یہ سمجھایا ہے کہ اُسے وہاں کس طرح رہنا چاہئیے۔اس میں ایسی
کام کی۔تجربہ کی۔دوراندیشی کی باتیں لکھی ہیں کہ پڑھنے کے قابل ہیں اور
ایسی صاف ستھری اور سادہ زبان میں لکھی ہیں کہ ایک بچہ بھی پڑھ سکے
اور سمجھہ لے اور اثر قبول کرے۔افسوس کہ یہ خط کسی قدر طویل ہے اور
ہم اُسے نقل نہیں کرسکتے۔اگرچہ یہ معمولی باتیں ہیں لیکن انہیں چیزوں سے
ایک انشا پرداز کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے —

اپنے ایک نیازمند کو لکھتے ہیں "اسلام نمبر میں آپ کا مضمون پڑھ کر
بہت لطف آیا۔نہایت پر زور مضمون لکھا ہے............آپ ہی کا حصہ تھا۔مگر
برٹش فارن پالیسی پر اس میں جابجا نوک جھوک کی گئی ہے وہ سراسر خلاف
مصلحت ہے............میں نہیں جانتا کہ مضمون کا کس قدر حصہ باقی رہا ہے۔
اس میں ہندوستان کی مسلمان ریاستوں کا ذکر ہوگا یا نہیں۔اگر آپ کی یہی
راست گفتاری رہی تو للہ آپ اس سلسلہ کو چھیڑنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیے"
نصیحت کی تلخی کو کس طرح تعریف کی شیرینی سے گوارا کر دیا ہے —

ایک دوست کی بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے۔تعزیت کا خط لکھا ہے۔اس میں
تحریر فرماتے ہیں "اگرچہ یہ موقع نصیحت و پند کرنے کا نہیں ہے مگر میں
اس مقام پر خاموش نہیں رہ سکتا۔خدا کے تمام کام حکمت اور مصلحت سے بھرے
ہوتے ہیں۔بہت سی باتوں کو ہم مکروہ جانتے ہیں مگر وہ ہمارے حق میں
اکسیر کا حکم رکھتی ہیں۔اتفاقات تقدیری سے جو آپ کو یہ آزادی حاصل
ہو گئی ہے اس کی قدر کرنی چاہئے اور اس سے کچھہ کام لینا چاہئے۔آپ کو
معلوم ہے کہ سید احمد خاں صاحب نے جو اس قدر شہرت اور عزت ملک و قوم
کی نظر میں حاصل کی اس کا کیا سبب ہے؟ میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ صرف
اس وجہ سے ان کو یہ رتبہ حاصل ہوا کہ اُن کی اہلیہ اُن کی جوانی میں مر گئی
تھیں۔بہت سے لوگوں نے اُن کو دوسری شادی کی صلاح دی مگر اُنھوں نے ایک

نہ مانی اور اپنے بچوں کو اپنے کنار شفقت میں لیا اور اُن کی تعلیم و تربیت میں کوشش کی اور اپنی دماغی طاقتوں سے جو بسبب تجرد کے اور زیادہ سرسبز اور شگفتہ ہو گئی تھیں وہ کام لئے جنھوں نے آج اُن کو تمام ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں مشہور اور نامور کر دیا۔ اگر وہ دوسری شادی کر لیتے تو ہرگز یہ رتبہ ان کو حاصل نہ ہوتا۔ آپ کے لئے یہ نہایت عمدہ موقع ہے کہ آپ ہمہ تن اولاد کی تربیت میں مصروف ہو جائیے اور نوکری بھی چاہے کرو چاہے نہ کرو اور اگر زیادہ ہمت ہو تو خود بھی تحصیل علم کرو اور ہرگز دوسرا خیال دل میں نہ لاؤ۔ میں سچ کہتا ہوں کہ پھر نہ اولاد کی تم کچھہ خبر لے سکو گے اور نہ اپنی زندگی کا کچھہ مزا اُٹھاؤ گے بلکہ زندگی تلخ ہو جائے گی اور اولاد بے علم رہ جائے گی اور اُن کو آپ سے کچھہ محبت اور اُلفت نہ رہے گی۔ اگر ان کو اپنا قوت بازو بنانا چاہتے ہو اور اپنی زندگی تلخ کرنا نہیں چاہتے اور اولاد کو علم و ہنر سکھانا چاہتے ہو تو کمال صبر و سکون اور عفت اور پاکدامنی کے ساتھہ تجرد اور آزادی میں بسر کرو"۔

جب کوئی اُن کی تعریف و ستایش کرتا تو اس کا جواب یا شکریہ تو لکھتے مگر بڑی خوبی سے ٹال جاتے تھے اور بعض اوقات اپنے متعلق بھی رائے دینے سے نہیں چوکتے تھے۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں "میں آپ کے ریمارکس کا جو آپ نے میری نثر کی نسبت کئے ہیں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں مگر سچ یہ ہے کہ ہماری اور ہمارے ہم عصروں کی نظم و نثر پر صحیح رائیں اُس وقت تک جب تک کہ ہم اور ہمارے طرفدار یا ہمارے مخالف دنیا میں موجود ہیں قائم نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ خود ہم میں سے کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے اسٹائل میں کونسی ایسی خوبی ہے جس کی وجہ سے وہ اُس کو اوروں کی طرز پر ترجیح دے سکتا ہے۔

می گریم و از گریہ چو طفلم خبرے نیست
در دل ہوسے ہست و ندانم کہ کدام است"

اسی شخص نے جب حیات جاوید پر تبصرہ کیا اور کتاب کی بہت تعریف کی تو اس کے جواب میں لکھتے ہیں "حیات جاوید پر آپ کا ریویو دیکھا جو کلمات بتقاضاے محبت تصنیف اور مصنف کے حق میں بے اختیار آپ کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں اگرچہ میں اپنے تئیں اُن کا مستحق نہیں سمجھتا لیکن بہر حال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہوں۔ یہ وہی خصلت ہے جس کو اہل ایران یار فروشی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ہماری زبان میں چھڑک چھڑک کر

بیچنا کہتے ہیں"۔

ایک عزیز کو اکسٹرا اسسٹنٹی کا عہدہ ملا۔تو اُنھوں نے مولانا کا شکریہ ادا کیا کہ یہ اُنہیں کی سعی اور محنت کی بدولت ہے۔مولانا اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں "جو باتیں تم نے میری نسبت لکھی ہیں یہ محض تمہاری سعادت مندی اور کسی قدر تمہاری نادانی کی دلیل ہے۔اگر بفرض محال میری کوشش کو تمہاری کامیابی میں کچھہ دخل ہو بھی تو اس کو تقریباً ایسا ہی سمجھنا چاہئے جیسا کہ ایک باپ کی کوشش کو بیٹے کی کامیابی میں ہوتا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔تعجب کی وہ باتیں ہیں جو آج کل دنیا میں لوگ کر رہے ہیں۔غیروں کے بچوں کو تعلیم دلواتے ہیں۔اپنی بساط سے زیادہ اُن کی امداد کرتے ہیں۔تمام قوم کے لئے ویسی ہی کوششیں کرتے ہیں جیسی کہ خاندان کا سرپرست اپنے خاندان کے لئے کرتا ہے۔اپنی جان اور مال اور وقت اور دل و دماغ کو قوم کے لئے وقف کر رکھا ہے۔قوم کی طرف سے اُن پر گالیاں پڑتی ہیں مگر وہ قوم کا خیال نہیں چھوڑتے اور رات دن اسی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔یہ لوگ ہیں جن کا ہم کو اور تم کو اور تمام قوم کو دل و جان سے شکریہ ادا کرنا چاہئے اور انہی کا صدقہ ہے کہ ہماری قوم میں کسی قدر آپس کی ہمدردی کا خیال پیدا ہوگیا ہے"۔

مولانا کے مزاج میں مزاح بھی تھا مگر بہت لطیف۔چنانچہ ان خطوں میں بھی کہیں کہیں اس کی جھلک نظر آتی ہے مثلاً وہ نواب محسن الملک مرحوم کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں "ان کا ارادہ ایسا ہی ہے جیسا ہر مسلمان حج کا ارادہ رکھتا ہے" یا وہ اپنے ایک نیاز مند کو لکھتے ہیں کہ "آپ کا آرٹکل جو علی گڈہ کالج کی شورش کے متعلق روزانہ پیسہ اخبار میں نکلا ہے۔میں نے کئی دفعہ پڑھا۔اس کا زور اور سچائی اور فصاحت دیکھہ کر طبعیت نہایت خوش ہوئی......کی حقیقت پر جو پردہ پڑا ہوا تھا آپ نے اس طلسم کو بالکل توڑ دیا۔سب سے زیادہ سچی بات جو آپ نے لکھی ہے وہ ٹرسٹیوں کی غفلت اور بے پروائی کا ذکر ہے۔ایک دانش مند کا قول ہے کہ جب کسی بد صورت آدمی پر لوگ کوئی پھبتی کہیں اور قہقہے لگائیں تو وہ بھی اُن کے قہقہوں میں شریک ہوجائے۔چونکہ میں بھی ننگ ٹرسٹیاں ہوں اس لئے میں بھی ٹرسٹیوں کی ندامت میں اُن کے ساتھہ شریک ہوتا ہوں"۔

چونکہ مولانا ایک مشہور اور نامور شخص تھے اس لئے اکثر عزیز اور

احباب اُنہیں سفارشوں کے لئے تنگ کرتے رہتے تھے۔ایک ایسی ہی فرمائش پر وہ لکھتے ہیں ”شاید تم اور اور لوگ یہ خیال کرتے ہوں گے کہ مجھے ہندوستان کے اطراف وجوانب میں ہزاروں آدمی جانتے ہیں۔اکثر معزز اور ذی اختیار لوگوں سے بھی مجھے تعارف ہے اور اکثر بزرگ میری عزت کرتے ہیں۔ پس میں جس کی جہاں کہیں سفارش کروں گا وہ ضرور کامیاب ہوگا۔لیکن اے عزیز یہ خیال بالکل غلط ہے۔دنیا دارالمعاوضہ اور دارالمکافات ہے۔جو شخص کسی کے ساتھ کچھ سلوک کرتا ہے کسی نہ کسی عوض اور بدلہ کی توقع پر کرتا ہے۔میں تمہاری ایک سفارش اس لئے منظور کرتا ہوں کہ مجھے تم سے دس فرمائشیں کرنے کا موقع ملے۔پس ایک ایسے شخص کی سفارش جس سے کسی طرح کا عوض متوقع نہ ہو کیونکر کارگر ہوسکتی ہے۔جب میں زمانہ کی نگاہ میں اپنی قدر و منزلت کا اندازہ کرتا ہوں تو اس سے زیادہ نہیں پاتا کہ ایک مشہور گویا جہاں کہیں جاتا ہے امرا اُس کی خاطر کرتے ہیں۔اور اگر وہ خود نوکری چاہتا ہے تو تھوڑی بہت نوکری بھی اُسے ہر جگہ مل جاتی ہے۔لیکن اگر وہ گھر بیٹھے اپنے دوستوں اور عزیزوں کی سفارشیں کرنی اختیار کرے تو کوئی اس کی طرف اصلا التفات نہیں کرتا۔یہی میرا حال ہے ...“

مولانا نے ایک النامہ بھی لکھا تھا جو اُن کی زندگی میں شایع نہیں ہوا کیونکہ اُس میں ہر فرقے اور گروہ پر چوٹ ہے۔چند جملے انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھے ہیں مثلاً المذہب۔اعلان جنگ۔الدین۔تقلید آبا واجداد۔العلم۔قسمے از جہل مرکب۔الامتحان۔آزمائش لیاقت ممتحنان۔الیونیورسٹی۔کارخانہ کلرک سازی۔العلی گڈہ پارٹی۔شہید وفا۔العلی گڈہ کالج۔پرورش گاہ طفلاں بدست مائندراں۔الکمیشن۔وجۂ موجہ برائے فیصلۂ یک طرفہ“—

ان خطوں میں کہیں کہیں ادبی نکات بھی ملتے ہیں مگر بہت کم۔یہ زیادہ تر کاتب یا پوچھنے والے پر منحصر ہے۔کسی نے اگر کوئی بات پوچھی ہے تو اس کا جواب معقول دیدیا ہے۔علاوہ اس کے یہ مجموعہ کامل نہیں ہے۔بہت سے ایسے خط ہوں گے جو تلف ہوگئے ہیں یا قابل مرتب کے ہاتھ نہیں لگے—

ان خطوں سے ایک اور حقیقت بھی معلوم ہوئی کہ جواہرات حالی میں جو حال میں شیخ محمد اسمعیل صاحب نے پانی پت سے شایع کی ہے۔بعض نظمیں چھوٹے بچوں کے لئے مولانا کے نام سے درج ہیں۔ان میں سے اکثر نظمیں مولانا کی لکھی ہوئی نہیں۔اصل حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے خلف الرشید

خواجہ سجاد حسین صاحب سے ان کے انسپکٹر تعلیمات نے بعض انگریزی نظموں کے ترجمے کی فرمائش کی۔انھوں نے ھامی بھرلی اور مولانا کو لکھا۔مولانا کو طوعاً کرھاً قبول کرنا پڑا۔لیکن اس زمانے میں مولانا علیل تھے اور علالت نے طول کھینچا تو انھوں نے یہ نظمیں مولوی محمد سعید صاحب مرحوم مدرس اول عربی و فارسی بورڈ ھائی اسکول دھلی سے لکھوادیں اور کہیں کہیں مناسب اصلاح کردی—

آخر زندگی میں مولانا خانگی جھگڑوں اور فکروں سے بہت عاجز آگئے تھے اور چاھتے تھے کہ کہیں فراغت اور اطمنان سے بیٹھہ کر کچھہ علمی کام کریں لیکن افسوس کہ یہ فراغت کبھی نصیب نہوئی۔بلکہ اسی پہ حیرت ھے کہ ان تمام حالات میں انھوں نے اتنا بڑا کام کیونکر کرلیا۔اردو ادب کے متعلق دو ایک کام اُن کی پیش نظر تھے جن کا مسودہ انھوں نے خوب غور کرکے اپنے دل میں قائم کرلیا تھا۔ان کی دلی تمنا تھی کہ اپنی زندگی میں انھیں پورا کردیں۔لیکن اس کا موقع نہ ملا اور وہ سارے مسودے دل کے دل ھی میں رہ گئے۔آخر آخر میں اُن کا ارادہ تھا (جیسا کہ اُن خطوں سے معلوم ھوگا) کہ اورنگ آباد میں رہ کر کچھہ کام کریں لیکن علالت نے مہلت نہ دی اور اسی علالت میں وہ اس دنیا سے رخصت ھوگئے۔تاھم وہ اتنا کچھہ اور ایسا کچھہ کر گئے ھیں کہ وہ کسی ملک اور کسی قوم میں ھوتے اُن کی ھستی قابل فخر سمجھی جاتی۔اُن کی زندگی علمی اور اخلاقی دونوں لحاظ سے ایسی پاک صاف۔خالص اور بے ریا ھے کہ ھمیشہ اھل وطن کی رھنمائی کرے گی اور اردو زبان پر تو اُن کا اتنا بڑا احسان ھے کہ اھل زبان اس سے کبھی سبکدوش نہیں ھوسکتے—

ادب میں سینکڑوں دلکشیاں ھیں۔اس کی بے شمار راھیں اور اَن گنت گھاتیں ھیں۔لیکن خطوں میں جو جادو ھے (بشرطیکہ خط لکھنا آتا ھو) وہ اس کی کسی ادا میں نہیں۔نظم ھو ناول ھو ڈراما ھو یا کوئی اور مضمون ھو غرض ادب کی تمام اصناف میں صنعت گری کرنی پڑتی ھے۔اور صنعت گری کی عمر بہت تھوڑی ھوتی ھے۔بناوٹ کی باتیں جلد پرانی اور بوسیدہ ھوجاتی ھیں۔صرف سادگی ھی ایک ایسا حسن ھے جسے کسی حال اور کسی زمانے میں زوال نہیں۔بشرطیکہ اس میں صداقت ھو۔اور ھم میں سے کون ھے جس کے دل میں سچ کی چاہ نہیں؟ یہ ھمارے خمیر میں ھے۔یہ ھماری فطرت کے ساتھہ پیدا ھوئی ھے۔جھوٹا بھی یہ نہیں چاھتا کہ کوئی اس سے جھوٹ بولے۔اور یہی وہ فطری تقاضا ھے کہ بعض اوقات ھم ایک سادہ سی صداقت کی خاطر دلکش سی دلکش

نظم اور دلچسپ سے دلچسپ ناول کو اُٹھا کے الگ رکھہ دیتے ھیں۔ ھماری ھر تصنیف و تالیف۔ ھماری ھر علمی اور ادبی کوشش جو قلم سے نکل کر کاغذ پر آتی ھے۔غیروں کے لئے ھے۔اور یہ سمجھہ کر لکھتے ھیں کہ غیروں کے ھاتھوں میں جائے گی اور غیروں کی نظریں اس پر پڑیں گے۔اس لئے مصلحت وقت کا بھی خیال ھوتا ھے۔عبارت آرائی بھی کرنی پڑتی ھے۔تکلفات بھی برتنے پڑتے ھیں۔خیال کو صاف صاف لکھنے کے بجائے طرح طرح کے پیرائے اختیار کرنے پڑتے ھیں۔لیکن جب انسان اپنے کسی عزیز دوست کو خط لکھتا ھے تو وھاں کوئی غیریت باقی نہیں رھتی بلکہ بسا اوقات دوی کا پردہ بھی اُٹھہ جاتا ھے۔وہ ھر مسئلہ اور ھر شے کے متعلق جیسا اُس کا خیال ھوتا ھے صاف صاف اور سچ سچ لکھہ دیتا ھے۔وہ اپنی راے میں آزاد ھوتا ھے۔وہ نہ دوسروں سے چوکتا ھے اور نہ اپنے آپ کو چھوڑتا ھے۔اس وقت نہ اُسے خوف لائم ھوتا ھے اور نہ نکتہ چیں کا کھٹکا۔خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ھے جو دلوں کو لبھا لیتی ھے اور یہی وجہ ھے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ھوتا ھے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ھو سکتا۔اُن خطوں میں وہ مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے سے آپ باتیں کرنے لگتا ھے۔جو خیال جس طرح اُس کے دل میں ھوتا ھے اُسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ھے۔نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کے رکھہ دیتا ھے اور اگر وہ دل ایسا ھو جو سراسر درد سے لبریز ھو۔جس میں ھمدردی نبی نوع انسان کوٹ کوٹ کے بھری ھو۔جو پریم کے رس سے سینچا گیا ھو۔تو بتاؤ کہ اُس دل کی تراوش کیسی ھوگی؟ اگر تم اس دل کی زیارت کرنی چاھتے ھو تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں لپٹا ھوا ھے*—

تبصرۃ الفہرست

دنیاے صحافت اور عالم اشاعت میں ارباب قلم کی صدھا قسمیں اور اھل انشا کی سیکڑوں قومیں آباد ھیں یہاں ان سب کے شمار و اعداد سے بحث نہیں بلکہ اس جم غفیر میں صرف دو اصناف کا تذکرہ مقصود ھے۔ایک وہ جو اپنی ذاتی ناموری و شہرت کی بدولت اشاعت کتب میں کامیابی حاصل کرتے

* کتاب دو جلدوں میں چھپی ھے جو تقریباً پونے آٹھہ سو صفحے پر ھے۔فاضل مرتب سے پانی پت سے یا انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے چار روپیہ کلدار میں مل سکتی ھے۔

هیں دوسرے وہ جن کو حسن اتفاق سے کتاب کے لئے ایسا موزوں و دلچسپ نام مل جاتا ھے جس کی عام دل پسندی تصنیف کے پہلے ایڈیشن کو ایک حد تک تاجران کتب اور اھل ذوق سے روشناس کر دیتی ھے۔ پہلی قسم کے اکثر مصنفین کو دو چار تصنیفوں کے بعد کچھہ ایسا مرض استغنا لاحق ھو جاتا ھے کہ اگر اُن کے موجودہ کارناموں کو دس برس پہلے کی تصنیفات سے ملایا جائے تو ان دونوں نمونوں میں باھم کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی وہ کاوش تحقیق اور سعی قلم جو نام آوری کی اُمید میں ابتداء نظر آتی ھے شہرت یابی کے بعد سہل انکاری سے تبدیل ھو جاتی ھے۔ اِلا ماشاءاللہ۔ اب رھے صنف ثانی کے حضرات اُن کے متعلق یہ سوء ظنی تو بہر حال بے محل ھے کہ وہ طالب شہرت نہیں : ع : جبل گردد جبلی بر نہ گردد۔ خوشامد پسندی اور شہرت طلبی انسان کی طبیعت ثانی بن گئی ھے اور چوں کہ اب اسی رنگ کو قبول عام حاصل ھے اس لئے کسی کو کسی سے جھینپنے کی ضرورت نہیں "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" مگر یہ واضح رھے کہ ایسی خود ساختہ طبیعت ثانی فطرت ازلی کو دبا نہیں سکتی اگر ان کی بر خود غلط خواھشات کو کامیابی حاصل نہ ھو تو کوئی تعجب کی بات نہیں موزونیت نام اور دل چسپی مضمون کی گندم نمائی سے ایک مرتبہ نقد سودا تو ھو جاتا ھے مگر تاجران کتب کی جو فروشی سے خریداروں کی نگاہ میں پھر کوئی ساکھہ قائم نہیں رھتی —

اس تمہید کے بعد جس کتاب کے متعلق چند خیالات کا اظہار منظور ھے وہ مذکورۂ بالا دونوں حیثیتوں کا مجموعہ ھے یعنی مصنف بھی غیر معروف نہیں اور مضمون و نام بھی بخصوصیت عام دل کشی کا ناز پرور ھے بایں ھمہ بحسرت کہنا پڑتا ھے کہ مرض استغنا کے ساتھہ عارضہ بے حسی بھی اس کی رگ و پے میں سرایت کئے ھوئے ھے —

پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ صاحب دھلوی نے حسب بیان خود انجمن ترقی اُردو کی تجویز کے مطابق الفہرست کو مرتب کرنا شروع کیا ھے اور مسلسل بیس برس کی محنت شاقہ کے بعد (۸۱۵) صفحات کی کتاب شائقین کے دست طلب تک پہنچائی ھے۔ کتاب مذکور جیسا کہ اُس کے اشتہار سے معلوم ھوتا ھے مطبوعات اُردو کی فہرست ھے۔ ادبی اھل مذاق میں شاید ھی کوئی کودن ایسا ھوگا جس نے الفہرست کا نام سن کر بے تابی کے ساتھہ اس کے مطالعے کی خواھش پیدا نہ کی ھو۔ ایسی مقبول انام کتاب کو کیسا ھونا چاھئے؟ اس توضیح سے پہلے مناسب معلوم ھوتا ھے کہ مرتب کے دیباچے کا اقتباس لکھا جائے جس سے یہ اندازہ

ہو سکے گا کہ اس کی ترتیب و تالیف میں کیا کیا وعدے کئے گئے ہیں اور اُن کا ثبوت کس کس طرح بہم پہنچایا ہے —

اقتباس دیباچہ

"سنہ ۱۹۱۳ع میں جب انجمن ترقی اردو قائم ہوئی تو ایک تجویز یہ بھی ہوئی تھی کہ ایک فہرست اُن تمام کتابوں کی مرتب کی جائے جو اس وقت تک تصنیف و تالیف ہو چکی ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہر فن میں کس قدر کتابیں کس کس پایے کی موجود ہیں تاکہ آئندہ اُن سے بہتر کتابیں تصنیف کرائی جائیں اور اُردو کا قدم علم کے میدان میں آگے بڑھایا جائے..... ملک میں ہر فن کے صاحب کمال موجود ہیں۔ میں نے چاہا کہ اُن کی مدد سے اس کام کو پورا کروں چنانچہ بعض صاحبوں سے التجا کی کہ اپنے اپنے فن کی کتابوں کی فہرست مرتب کر دیں ......مگر مجھے یہ ظاہر کرتے افسوس آتا ہے کہ پوری ایک نے بھی نہ دی اور تو اور مصنفین سے ان کی تصانیف کی فہرست پوچھی تو اکثر اصحاب نے راقم کے نیازناموں کا جواب بھی نہ دیا مجھ اکیلے سے جو کچھ ہو سکتا تھا کئے جاتا تھا آج پورے تیس برس اس دھن میں کٹ گئے والی مملکت دکن کی سرپرستی نے میری ہمت کے بازوؤں میں نئی طاقت پیدا کر دی اور میں ہمہ تن علمی مشاغل میں مصروف رہا اور جیسی مجھ سے ہو سکی فہرست مرتب کر دی......مجھ کو اعتراف ہے کہ فہرست ناقص ہے اور بہت سی باتیں اس میں اصلاح کے قابل ہیں اُردو ایک زندہ زبان ہے اور وہ بھی نو عمر۔ اس میں روز بروز نئی کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں اس سبب سے یہ کوشش کہ تمام کتابوں کے نام اس میں آجائیں کبھی بارآور نہیں ہو سکتی فہرست کا نامکمل اور ناقص رہنا لازم ہے۔ ممکن ہے کہ اثنائے طبع میں ایسی بہت سی کتابیں تصنیف ہوئی ہوں جن کے نام اس میں نہ ہوں......جب خطوط سے کام نہ چلا تو میں نے ارادہ کیا کہ خود ہی سفر کروں اور ہندوستان کے بڑے بڑے کتب خانوں میں جا کر کتابوں کے متعلق معلومات حاصل کروں اس غرض کے لئے میں نے سرکار سے تین ماہ کی رخصت مانگی سرکار نے کتاب کی تیاری کے لئے روپیہ بے دریغ

دیا لیکن وقت دینے میں تامل فرمایا ناچار مجھے بھی جو کچھ
جمع ہو گیا تھا اُسی پر قناعت کرنی پڑی" (اسی سلسلۂ عبارت
کے ساتھ وقت نہ دینے کے ثبوت میں معتمد صاحب تعلیمات کا
مراسلہ نشان ۱۹۶۴/۱۹۶۵ نقل کیا گیا ہے جس سے مولف
کی دقت نظر اور اعتقاد صداقت پر آفریں کہنے کو جی چاہتا ہے)

یہ اقتباس دیباچہ کے ۲ صفحوں سے کیا گیا ہے۔اورکتاب کے نفس ترتیب کی بحث انہیں سطروں میں ختم کردی گئی ہے۔اس کے بعد آخر دیباچے تک اُردو زبان کی ابتدائی و تمہیدی تاریخ اور بعض مصنفین کی کتابوں کا ذکر اور انجمن ترقی اُردو کی مطبوعات کا تبصرہ ہے۔غرض کہ اس التقاط سے مولف کی مجبوریوں اور ہندوستان کے بڑے بڑے کتب خانوں تک نہ پہنچنے کا حال معلوم ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس کے اُن کے انہماک وشغف اور مالی بے فکریوں کا اندازہ بھی ظاہر ہورہا ہے۔اس مسئلۂ جبر و اختیار کے سمجھنے کے بعد اگرچہ اہل ذوق کی توقعات بہت محدود رہجاتی ہیں پھر بھی (۸۱۵) صفحات کا حجم کافی امید افزائی کا ضامن ہوسکتا تھا۔یعنی اس عبارت میں اگر فہرست کے ناقص رہنے کے اعتراف پر بیان ختم ہوجاتا تو یقیناً ماننا پڑتا کہ صاف گو مرتب نے ایک ناقص کتاب کو بمجبوری یا بضرورت شائع کردیا ہے مگر اس کے بعد کا سلسلۂ عبارت ثابت کرتا ہے کہ مذکورہ جملے نہ صرف رسمی تکلف ادبی کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں بلکہ حقیقتاً وہ اس تفصیل کا اجمال ہیں کہ دوران طبع میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ اس فہرست میں درج نہیں ورنہ اس سے پہلے کی اکثر مطبوعات مندرج کردی گئی ہیں—

۸۱۵ صفحوں کی کتاب کے ساتھ مقدمے کا جتنا تعلق ہوسکتا ہے وہ ۲ صفحوں سے ایک سطر بھی زیادہ نہیں اُس کے بعد تاریخ اُردو کے لئے ۳ صفحہ دیے گئے ہیں۔ اگرچہ اس تاریخی تحقیقات میں یہاں کسی عام تنقید کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی تاہم بطور فائدہ ایک غلط فہمی کا رفع داد نا مناسب نہ ہوگا۔دیباچے کے صفحہ ۶ پر عبارت ذیل پڑھی جاے:—

مخاطب کو اپنا مفہوم سمجھانے کے لئے مسلمانوں نے بھاشا اور
ہندوں نے فارسی الفاظ بولنے شروع کئے۔ہوتے ہوتے اس اختلاط نے
ایک تیسری زبان ایسی پیدا کردی جس کو نہ فارسی ہی کہہ
سکتے ہیں نہ بھاشا۔بلکہ ہندو مسلمانوں کی ضرورت پورا کرنے کی
ایک مخلوط زبان تھی۔شاہجہاں کے زمانے میں جب دہلی

دارالخلافہ قرار پائی تو ہر ملک کے لوگ جو مختلف پیشے (اس کے بعد کا لفظ پڑھا نہیں جاتا شاید "زبانیں" ہو جس کو زیافت کاتب نے لکھدیا ھے) رکھتے تھے دھلی میں آکر جمع ہوے اور یہ زبان باھمی تفہیم مطالب کا آلہ بن گئی - اور اُردو کہلائی"—

آب حیات اور اُس کے بعد اُس کی تائید و تقلید میں جتنی کتابیں مرتب ہوئی ھیں اُن سب نے یہ غلط خیال پھیلادیا ھے کہ اُردو کا نام (بہ حیثیت زبان) شاھجہان کے عہد سے مروج ہوا ھے - حالانکہ اُس وقت عموماً اُردو کا مفہوم لشکر یا لشکر گاہ کے سوا کچھہ اور نہیں سمجھا جاتا تھا - تغلقی عہد کے امیر خسرو ہوں یا علی عادل شاھی نصرتی و ھاشمی حتی کہ محمد شاھی زمانے کے ولی - حاتم - آبرو - آرزو وغیرہم سب کے سب بغیر کسی شبہے اور استثنا کے اس ممزوج زبان کو ریختہ کہتے رھے ھیں - یہاں تک کہ اب سے پون صدی قبل مرزا غالب بھی کہتے ھیں—

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑہ کے اُسے سنا کہ یوں

بظاہر اس غلط اشاعت و یقین کا سبب اُردوے شاھجہانی کا لقب ھے جو محض اُس لشکری بازار کو دیا گیا تھا جو صاحب قراں کے حکم سے قائم کیا گیا تھا - اگر دکھنی اور دھلوی تاریخی منقولات ادب غلط مان لی جائیں تو ایسی نفی کا اثبات محال ھے ورنہ کون ھے جس کو "خالق باری" اور "علی نامہ" جیسی مولفات دیکھنے کے بعد یہ وھم بھی ہوسکتا ہو کہ اُردو شاھجہاں کے عہد میں پیدا یا مروج ہوئی اور بفرض محال اگر لفظ اُردو کا استعمال عصر کہن میں کسی زبان کے لئے ثابت بھی ہوجاے تو سعدی دکنی اور امیر خسرو وغیرہم کے اشعار دیکھتے ہوے اُردوے شاھجہانی کی جگہ اُردوے تغلقی یا عادل شاھی کہنا حق بجانب ہوگا اور اس طرح سلف صالحین کی محنت کا شکریۂ اعتراف نہ سعادت اخلاق کا ثبوت مانا جاے گا—

اسی سلسلۂ تحقیقات تاریخی میں میر شیر علی افسوس کی کتاب باغ اُردو کا زمانۂ تالیف بھی غلط بتایا گیا ھے - باغ اُردو تاریخی نام ھے جس سے سنہ ۱۲۱۴ ھجری بر آمد ہوتے ھیں اور اُس کی مطابقت سنہ ۱۸۰۰ ع سے ہوتی ھے یہ سنہ آغاز تالیف کا ھے اور انجام کی تاریخ "آغاز اُردوی" ھے جس سے سنہ ۱۲۲۴ ھجری حاصل ہوتے ھیں مگر مرتب الفہرست نے سنہ ۱۷۷۲ ع چھپوائے ھیں جو شاید اُن کی ولادت کا زمانہ ہوسکتا ہو—

اتنی دیباچہ نویسی کے بعد صفحہ (۸) کے آخر سے صفحہ (۱۷) تک مطبوعات انجمن ترقی اُردو کی جو فہرست و تشریح کی گئی ہے اُس کی تصحیح و تغلیط کا بار انجمن مذکور کے روضہ نشین سکریٹری صاحب کو اپنے سر مبارک پر لینا چاہئے۔کیوں کہ راقم عاجز کو ابھی جتنے بھاری پتھروں کو چوم کر چھوڑنا ہے اُن کے مقابل میں مطبوعات انجمن کا شمار صفر (۰) کا مترادف ہے —

دیباچے سے گزر کر سب سے پہلے جو ورق سامنے آتا ہے اُس پر مضامین مندرج کی فہرست بر محل چہرہ کشا ہوتی ہے۔غالباً مرزا صاحب نے طوالت و صرفۂ کاغذ کے ڈر سے مضامین کے خانۂ شمار کو ”چون مد بحساب اندر“ سمجھہ کر تبصرہ نویس کو عقد انامل کا عادی بنانا چاہا ہے۔چناں چہ اس چھوٹی ہوئی عادت کو از سرنو یاد کرنے کی زحمت گوارا کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ترتیب مضامین کا شمار (۹۴) تک پہنچتا ہے۔اگر ہر مضمون سے پہلے شمار کا نمبر بھی ہوتا تو یقیناً اس شکوۂ واجبی کی گنجائش نہ رہتی۔بہر حال اس نود و چہار یعنی ہم جوار ۹۹ نود و نہ کے پھیر سے نکل کر ترجمۂ قران مجید کی تلاوت کا شرف حاصل ہوتا ہے اور ساتھہ ہی ساتھہ سرسری نگاہ سے یہ بھی نطر آتا ہے کہ دقیقہ رس مرتب نے مختلف مذاہب کی کتابوں کو جدا جدا دکھایا ہے۔مثلاً:۔فقہ (غالباً اہل سنت) فقہ اہل تشیع۔دینیات۔اہل سنت و جماعت۔دینیات اہل تشیع۔مذہب نصاریٰ۔مذہب ہنود۔اس احتیاط و تشریح کا اقتضا تھا کہ ترجمۂ قران شریف میں بھی اہل سنت و تشیع کی تفریق کردی جاتی۔خدا جانے کوئی نا معلوم مصلحت تھی یا غفلت مجہول کہ اس قیاس مع الفارق کو متحد سمجھا گیا —

قران شریف کے بعد تفسیر کا نمبر ہے اور اسی سے متصل تجوید کا حالانکہ اصول تفسیر اور اصول فقہ یہ دونوں مشہور و مستقل فن مانے جاتے ہیں ان کا عدم اندراج بھی تعجب خیز ہے۔اسی سلسلے میں سب سے زیادہ حیرت اسماءالرجال کا عنوان نہ پا کر ہوتی ہے۔تذکرۃالشہدا کے عنوان کے بعد تذکرۃالاولیا کا عنوان بھی ضروری تھا مگر شاید اس پہلو تہی میں فلسفۂ عملی کے ماہر کی کوئی حکمت عملی پوشیدہ ہوگی۔فہرست مضامین کی اسی قدر تنقید اور تشریح کافی ہے۔ناظرین خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ ایسی کتاب کو کیسی فہرست کے ساتھہ مرتب ہونا چاہئے تھا اب آئیے اصل کتاب کو کھول کر دیکھا جاے کہ اس عنوانی ترتیب میں کسی خاص مصروفیت و تنگی

وقت کی وجہ سے تساہل و تسامح بعید از قیاس نہیں —

رسالہ اُردو اپنے طویل الذیل حجم کی بدولت جوع المضامین کا ضرور عادی ہے مگر ڈرتا ہوں کہ نقد و نظر کی لطافت و لذت اس داستان دراز کو اتنا نہ بڑھا دے کہ موجودہ اشاعت میں دوسرے مضامین کی جگہ نہ رہے اس لئے حتی المقدور کوشش کی جائیگی کہ مختصر مگر مدلل تبصرے پر مضمون کو ختم کر دیا جائے۔ فہرست مضامین کے ۹۴ عنوانات کے نمبروں کی تفصیل غیر ضروری ہے اور وہ اس لئے کہ تمام عنوان کے تحت میں ایک ربع خانہ پری بھی مکمل نہیں ایسی حالت میں ایک ایک نمبر کے لئے ایک دوسری (۸۱۶) صفحوں کی کتاب لکھنا کم از کم اس وقت میرے امکان سے باہر ہے۔ قصہ کوتاہ اور انکار سے پہلے اُس نقشے کی نقل کی جاتی ہے جس کے تحت میں تمام کتابوں کی فہرست ہے: —

نمبر	نام کتاب	نام مصنف	سنہ اشاعت	تعداد صفحات	قیمت	نام مطبع	ملنے کا پتا	کیفیت

بادی النظر میں یہ خانہ کشی معلومات بڑھانے کے لئے کافی و موزوں ہے مگر جس کاوش و خیال سے یہ عنوانی نقشہ قائم کیا گیا ہے اُسی توجہ سے خانہ پری بھی کی جاتی تو یہ فہرست اپنی نوعیت میں بے مثل کتاب ہوتی دو ایک عنوان اس نقشے میں زائد بھی ہیں اگر وہ نہ ہوتے تو کوئی مضائقہ نہ تھا کیوں کہ اُن کے ہونے سے مستقبل کوئی مستقل فائدہ نہیں۔ مثلاً (قیمت کتب اور ملنے کا پتا) یہ عنوان اس لئے مدفضول ہیں کہ ایک نہیں سیکڑوں کتابیں ایسی ہیں جن کے انطباع کا موقع صرف ایک بار ہاتھ آیا ہے اور اُس طباعت کو بھی اتنا عرصہ ہوچکا ہے کہ کسی مطبع یا کتب فروش کے پاس اُس کا ہونا یقینی نہیں۔ ان عنوانوں کے عیوض میں اگر دو عنوان اور قائم کئے جاتے تو یہ فہرست نہ صرف کتابوں کے نام اور پتہ بتاتی بلکہ مختصر تاریخ ثابت ہوتی۔ وہ عنوانات مختصراً حالات مصنف اور مجملاً مضمون تصنیف کی تنقید کے متعلق ہونے چاہئے تھے۔ اس زمانے میں فہرست کتب شائع کرنے کی اصلی غایت اس سے بہتر اور کیا ہوسکتی ہے کہ ناظرین فہرست اصل کتابوں کے مطالعے سے ایک حد تک مستغنی ہو جائیں اور جس قدر ضروری باتیں ایک تصنیف میں ہوتی ہیں اُن سب کا مختصر نمونہ فہرست میں نظر آجائے۔ ظاہر ہے کہ تعداد صفحات کے شمار سے بہتر یہ مفید باتیں تھیں کہ کتاب کا مالہ وماعلیہ اور مصنف کے خاص

خاص مفید و مشہور واقعات مثل توطن و سنین ولادت و وفات وغیرہ معلوم ہوتے رہتے۔اگرچہ دریائے معلومات کے مقابل میں یہ ایک چھنیٹا ہوتا پھر بھی اس اوس سے تشنہ کامان تاریخ کی پیاس تھوڑی بہت ضرور بجھہ جاتی—

اس عنوانی تبصرے کو ختم کرکے تکمیل خانہ پری پر جب نظر پڑتی ھے تو مدون فہرست کی شان سادگی (عدم خانہ پری) نئی بہار دکھاتی ھے۔تراجم قران شریف میں ۲۰ ترجمے درج کئے گئے ھیں مگر ان میں خانہ کشی کے حساب سے بصنعت تصنیف فرو گزاشتیں موجود ھیں۔جن کی تشریح حسب ذیل ھے:—

(۱) خانۂ کیفیت میں ۲۰ کیفیتوں کی جگہ صرف ۲ کیفیتیں مندرج ھیں اور وہ بھی مجہول—

(۲) ملنے کے پتوں میں صرف (۷) پتوں کا نشان ھے۔۱۳ ندارد—

(۳) مطبعوں میں بھی نصف نام چھپے ہوئے ھیں اور حیرت ھے کہ مرزا حیرت۔مولوی نذیر احمد اور شاہ عبدالقادر کے ترجموں کی جاے طباعت تک مفقود ھے—

(۴) قیمت کا شمار بھی نصفا نصف ھے—

(۵) صفحات میں صرف (۹) مجلدات کے شمار کی غالباً خیالی یا تخمینی تکلیف گوارہ کی گئی ھے—

(۶) سنہ اشاعت میں حکومت تثلیث کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ھے—

(۷) مترجمین (مصنفین) کے ناموں میں بھی پانچ نام کسی خصوصیت سے دو چار معلوم ہوتے ھیں—

(۸) اب رھے کتابوں (قران) کے نام جن کو ترجمۂ قران کے سوا کسی نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔مگر اس فہرست میں تراجم قران کے نام یہ ھیں:—

(الف) اعجازالقران۔معجزات قرانی کی بحث میں یہ کتاب لکھی گئی ھے۔لفظاً لفظاً تو کیا جستہ جستہ بھی ترجمے کا پتہ نہیں—

(ب) اعجازالبیان فی لغات القران—

(ج) مفتاح القران—

(د) لغات القرآن—

(ہ) دلیل الحیران—

(و) کلید خزائن قران—

(ز) جواهر قرانی—
(ح) معجزات القران—
(ط) جواهر الصمدیه فی احکام القرانیه—
(ی) اقتباس الانوار من کلام الغفار—
(ک) فہرست المضامین من کلام رب العالمین—

جیسا که ان کتابوں کے ناموں سے ظاہر ہے وہی مبحث یعنی خاص خاص مضامین قرانی یا فہرست و الفاظ فرقانی نظر آتے ہیں۔ان کو مستقلاً ترجمے میں شامل کرنا مرزا صاحب ہی کا کام تھا۔اگر اس قسم کے امتزاج کی اطلاع مقدمے میں لکھہ دی جاتی تو اصولی فرو گزاشت کے سوا اشترا کی غلطی کی گرفت کا موقع نہ ملتا۔ایک نئی اور مفید معلومات اس نمبر میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ فتح الحمید نامی ایک ترجمۂ قران نواب محمد حسین قلی خاں نے اور ایک ترجمہ قران مولوی نصیرالدین نے بھی کیا ہے۔اول الذکر کے خانۂ کیفیت میں یہ الفاظ درج ہیں (لفظی ترجمہ برائے اہل تشیع)۔موخرالذکر بجز لفظ آگرہ (نام مطبع) اور ہر ایک خانہ پری سے معرا ہے۔شایقین ترجمہ عموماً اور برادران شعیہ خصوصاً نواب محمد حسین قلی خاں کے لفظی ترجمے کے جس قدر مشتاق ہوسکتے ہیں۔اُس کا اندازہ مجھہ سے زیادہ بعض ناظرین کو ہوگا۔افسوس ہے کہ اس مفید تحقیقات کو ایسی بے پروائی سے ختم کیا گیا ہے کہ بجاے شکر مدون کا شکوہ زبانوں پر جاری ہے۔علاوہ تراجم اہل سنت مولوی مقبول احمد اور مولوی فرمان علی کے شیعہ ترجمے آج کل اس قدر دائر و سائر ہیں کہ دہلی اور قریب قریب اکثر بڑے بڑے شہروں کے کتب فروش بھی اُن سے نابلد نہیں مگر مدون الفہرست لا علم ہیں۔العجب !! یہ ایک عنوان فہرست کی مجملاً تفصیل کی گئی ہے اگر اسی حیثیت سے تمام عنوان کی شرح کی جاے تو صفحات اُردو کیا اوراق زمین و آسمان سے آبین ان یحملنہا کی صدا بلند ہونے لگے۔جس کتاب کی باے بسم اللہ میں یہ حالت ہو اُس کی تاے تمت تک پہنچنا اگر " کوہ کندن و کاہ برآوردن نہیں " تو " صبح کرنا شام کا لانا ہے جوے شیر کا " ضرور ہے۔اس لئے ہر عنوان کی خانہ پری کو اس تفصیل سے بیان کرنا غیر ضروری ہے۔من شاء التفصیل فلیرجع الی الفہرست (مگر مفت)—

اگرچہ ناظرین سے زیادہ راقم الحروف اس تبصرے کی طوالت سے گھبرا رہا ہے مگر چوں کہ ہر عنوان کے تحت میں مختلف صنعتوں کے ساتھہ ترتیب کی

نیرنگیاں نظر آتی ہیں اس لئے دیدۂ و دانستہ تبصرہ نویسی کے معمولی فرائض بھی ادا نہ کرنا شایقین الفہرست کو دھوکا دینا ہے۔ تمام عنوانوں سے جملہ قسم کی غلطیوں کا احصا و شمار آسان نہیں لہذا صرف اقسام اغلاط کی تعداد کا حتی الامکان لحاظ رکھا جائے گا نہ یہ کہ (۸۱۵) صفحات کے مجموعۂ اغلاط کو گنوایا جائے۔ ان چند نمونوں کی سیرھی سے اہل مذاق سیر ہو جائیں گے اور سمجھ سکیں گے کہ کس قدر دیدہ ریزی اس مدون نے مفید کام کی تدوین میں فرمائی ہے:—

اقسام اغلاط

(۱) مختلف فنون کی کتابوں کا تصادم یعنی تراجم سے لغات اور تاریخ سے ناول کو بھڑا دیا ہے—

(۲) ایک مضمون کی تصنیف کو دو کیفیتوں میں منقسم کر دیا ہے۔

(۳) معمولی اور متداوّل کتابوں کی حقیقت و حالت غلط لکھی ہے یا عنوان کے خانوں کو خالی چھوڑ دیا ہے—

(۴) ایک کتاب کو ایک ہی عنوان میں مکرر دکھایا ہے۔

(۵) بعض مشہور ترین تالیفات حال کو درج نہیں کیا ہے—

(۶) اُردو کتابوں کی فہرست میں فارسی و عربی کی کتابیں بغیر اطلاع ترجمہ اصل مصنفین عرب و عجم کے ناموں کے ساتھ درج کی گئی ہیں۔

(۷) عموماً عنوانات لکھنے کے لئے ایک صفحہ مخصوص کیا گیا ہے مثلاً تراجم قرآن۔ تفسیر و غیرہ۔ لیکن متعدد عنوانات ایسے بھی ہیں جن کو یہ تمغاے امتیاز عطا نہیں ہوا—

(۸) ایک طرح کی کتابوں کے خواہ مخواہ دو عنوان قائم کئے گئے ہیں مثلاً سیرت نبی۔ مولود شریف و سوانح عمری رسول اکرم—

(۹) خانۂ شمار کے ہندسے بعض عنوانوں میں غلط ہیں—

(۱۰) مصنفوں کے نام غلط لکھے ہیں (دیکھئے صفحہ ۸۸)

اب اس اجمال کے تفصیلی نمونے ملاحظہ ہوں:—

(۱)

(الف) تراجم قرآن کے ساتھ جو لغات قرآن وغیرہ کی غیر متعلق کتابیں شامل کی گئی ہیں اُن کے نمونے اس سے پہلے لکھ دئے ہیں مکرر تکلیف نظر فضول ہے—

(ب) موضح القرآن۔ مصنفۂ شاہ عبدالقادر دہلوی۔ یہ نام شاہ صاحب کے

ترجمۂ قرآن کا ہے جیسا مولوی نذیر احمد نے اپنے ترجمۂ قرآن میں خبر دی ہے —

(ج) عنوان تفسیر کے اکیسویں نمبر میں مقدمۂ تفسیر القرآن مصنفہ مرزا حیرت دہلوی بہ تعداد صفحات (۷۱۸) بغیر اظہار قیمت درج ہے اور اس کے بعد نمبر ۲۴ میں تفسیر القرآن اسی پر حیرت مصنف کے نام سے بہ تعداد صفحات (۷۲۰) بہ قیمت چھہ روپیہ سنہ ۱۲۲۲ کی مطبوعہ موجود ہے۔ اس اندراج کے متعلق کئی باتیں تنقیح طلب ہیں۔ اول یہ کہ سنہ ۱۲۲۲ ھجری ہیں یا عیسوی ہیں۔ اگر ھجری ہیں تو مرزا حیرت کی زندگی قابل رشک ہے اور اگر عیسوی ہیں تو غالباً اب حضرت عیسیٰ کی دوبارہ تکلیف فرمائی تحصیل حاصل ہے : ع : عیسیٰ کی ہیں اس نے آنکھیں دیکھیں۔ بہر حال اس لطیفۂ سخن میں یقیناً ایک شوشے کا فرق کاتب کے سر تھوپا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۳ کو ۱۲ لکھہ گیا ہو گا۔ مگر اس تعجب کا کیا علاج کیا جائے کہ جس تفسیر کا حجم ۷۲۰ ہو اُس کے مقدمے کی ضخامت صرف دو صفحے کم ۷۱۸ دکھائی گئی ہے۔ اکثر مدعیان وقوف اب تک مولوی عبدالحق صاحب کو الفضل للمتقدم کا دعویدار و مستحق سمجھے ہوئے تھے مگر ایسی مقدمہ بازی کے سامنے : ع : غلط است اُنچہ مدعی گوید —

(د) تفسیر القرآن مصنفہ سرسید احمد خاں مطبوعہ نول کشور لکھنؤ (۱۳۱۵) قیمتی چالیس روپیہ ضرور قابل دید تفسیر ہو گی (یعنی مطبوعہ نول کشور) چوں کہ تعداد صفحات لکھنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی اور مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں بھی پتہ نہیں چلا ناظرین کرام میں کوئی مبصر توجہ فرما کر تکلیف اطلاع گوارا کرے تو راقم حروف بے حد ممنون ہو گا —

(ہ) تراجم قرآن کے نمبر ۹ میں اعجاز القرآن مصنفہ مولوی ابوالحسن صدیقی مندرج ہے یہی نام اسی مصنف کے نام سے تفسیر میں درج ہے صرف فرق اتنا ہے کہ پہلی نظامی بک ایجنسی سے ۶ آنہ میں ملتی ہے اور دوسری ۲ آنہ میں مقنن دکن حیدرآباد میں چھپی ہے۔ اب اس صغریٰ و کبریٰ سے ناظرین جو چاہیں نتیجہ نکال لیں —

(و) فن تجوید میں نجوم القرآن - حرز الاصول الفروع - رموز القرآن -

وجوہ المثانی - آداب قرآن کے نام بھی موجود ہیں جن کو فن
قراءت سے کوئی واسطہ نہیں —

(ز) علم اخلاق کی بعض کتابوں کے نمونے یاد رکھنے کے لایق ہیں —
شیشے کی پری - جو ما فگو - اخلاق کاشی - آئینہ ہند - باغ بہاری -
جی گھام - کچکول بجوا - لال چندریکا - پریس باغ - ان کتابوں کے
ساتھہ چند خاص کتابیں اور ہیں جن کا نمونہ نمبر ۶ میں دیکھا
جائے اور پھر اس سنگم کے جوڑ کی خوش ربطی کو سراہا جائے —

(ح) تاریخ انگلستان کے عنوان میں تاریخ روم بھی شامل ہے اور
ایران کی سیاسی تاریخوں کے ساتھہ شعرالعجم میں جو عذوبت ہے
اس کی داد دینے سے لب چپکتے ہیں —

(ط) تصوف ہنود پوتھی گیان پرشاد سے شروع ہوتا ہے اور ارتقائی
معراج معرفت پاتا ہوا فصوص الحکم اور دریاے حقیقت سے عبور
گزرتا ہے پھر رسالۂ شرافت پر ختم ہوجاتا ہے - اس عنوان میں
جس صنعت تعطیل سے کام لیا گیا ہے اس کا تذکرہ نمبر (۷) میں ہوگا —

(ی) اور فنون کے مقابل میں نسبتاً تاریخ کے مختلف شعبے دکھاے
ہیں اور کوشش کرنی چاہی ہے کہ ہر طبقے کی تاریخ جدا جدا
دکھائی جاے مگر اس میں جو کمال کیا گیا ہے وہ بغیر اصل
کتاب کے دیکھے ہوے سمجھہ میں نہیں آسکتا - المختصر بہت سے
شعبے لکھتے لکھتے جب تھک گئے ہیں تو ایک عنوان " تواریخ
کی مختلف کتابوں " کا قائم کیا ہے - اس ذیل میں جو غیر معروف
و غیر متحقق یعنی متفرق کتابیں درج کی گئی ہیں اُن میں
چند کے نام یہ ہیں :- تاریخ عالم - تاریخ الکملا - تاریخ چترال -
تاریخ چین - سلسلۃ الملوک (سرسید) تاریخ امریکہ کامل —

(۲)

اس مد میں ناظرین نے مرزا حیرت کی تفسیر القرآن اور مقدمہ تفسیر القرآن
کا حال پڑھ لیا ہے - اس سے زیادہ معلومات بڑھانی ہے تو خطبات احمدیہ -
اور تفسیر قرآن مولفہ سرسید احمد خاں دیکھہ لیجیئے - اس سے زیادہ ورق
گردانی کو جی نہیں چاہتا —

(۳)

(الف) سیرۃ النبی (مولانا شبلی) جس کے دو حصے الفہرست کے شائع

ہونے سے پہلے چھپ چکے تھے اُن میں سے صرف حصۂ اول لکھا ہے اور اُس کی قیمت مبلغ ۱۵ روپیہ لکھی ہے۔ حالانکہ ہر حصے کی ۶ روپیہ عام قیمت ہے —

(ب) مولود شریف شہید میں باوجود یکہ مؤلف کا تخلص موجود ہے مگر خانۂ مصنف و اشاعت وغیرہ کو خالی چھوڑا گیا ہے —

(۴)

اس مد کی موجیں بے پناہ ہیں۔ ایک سلسلۂ تاریخ ہی میں متعدد مثالیں موجود ہیں —

(الف) سیرۃ النبی کے عنوان میں منہاج النبوت دو جگہ۔ سوانح عمری آنحضرت بغیر نام مؤلف ۲ سے زیادہ جگہ —

(ب) صفحہ (۸۰۴) میں بذیل انشا درد محبت اور اردوے معلی مکرر —

(ج) تعلیم نسواں میں لاثانی اُستانی اور وکیل نسواں مکرر —

(د) آثار الصنادید مکرر —

(ہ) سوانح مولانا روم مکرر —

(و) البرامکہ مکرر —

(۵)

کیا ناظرین متحیر نہ ہوں گے کہ مولانا شبلی نعمانی کی تصنیفات میں "الفاروق۔ موازنہ انیس و دبیر۔ سیرۃ النعمان۔ اور مولانا حالی کا دیوان اور غالباً حیات سعدی اور یادگار غالب بھی اس فہرست میں نہیں ملتی۔ اس سے زیادہ چراغ تلے اندھیرا کیا ہوسکتا ہے کہ خود مرزا صاحب نے بعض اپنی تالیفات کو نہیں درج کیا۔ مثلاً الاستدلال۔ تہنائے دید وغیرہ شاید ازراہ انکسار ایسا کیا ہو۔ حالانکہ الفہرست کے آخری پٹھے پر تمام تصانیف کا اشتہار مع قیمت موجود ہے —

(۶)

غنیۃ الطالبین مولفۂ شیخ عبدالقادر جیلانی۔ فصوص الحکم۔ عوارف المعارف۔ شیخ شہاب الدین۔ مآثر الکرام حضرت آزاد بلگرامی — وغیرہ اکثر کتابیں اصل مصنفین کے نام سے بغیر اطلاع ترجمہ موجود ہیں —

(۷)

صفحہ (۱۰۷) سے جو کتابیں شروع ہوئی ہیں اُن میں پوتھی جانکا بھوں اگم سندیش۔ کبیر جوگ یادگار رام۔ امر گرنتھہ۔ مقالات الاحسان فی مقامات العرفان۔

کلمات صوفیہ غرضکہ سو سوا سو کتابیں صفحہ (۱۲۰) تک لکھی گئی ہیں مگر ان کا نہ کوئی عنوان ہے نہ کہیں شمار کا نمبر۔

(۸)

تاریخ کے عنوان میں پہلا شعبہ (سیرۃ النبی) ہے اس میں بھی مولود سعدی و مولود شہید وغیرہ موجود ہیں اور پھر اسی سے متصل سوانح عمری جناب رسول اکرم کا عنوان ہے وہاں بھی اسی قسم کی کتابیں دکھائی گئی ہیں اور ان دونوں سلسلوں کے بعد مولود شریف کا مستقل عنوان قائم کیا گیا ہے جس میں پھر وہی مولودوں کی گردان۔ (سلمو یا قوم بل صلوا علی الصدر الامین)۔

(۹)

صفحہ (۱۶۰) کے عنوانی نمبر پر دس کا ہندسۂ شمار نظر آئے گا مگر صفحہ (۱۶۱) پر بلا فصل ۶۱ تا (۱۰۱) شمار کے نمبر ہیں۔حالانکہ صفحات (۱۶۰) و ۲۶۱ میں غلطی نہیں۔

(۱۰)

یہ خاتمے کا بند تو قیامت ہی کا مقطع ہے۔علم اخلاق کے بائیسویں نمبر میں (تہذیب الاخلاق کی جلدیں) کتاب کا نام ہے۔اس کے بعد مصنفین میں جلد اول محسن الملک۔جلد دوم سر سید احمد خاں جلد سوم اعظم یار جنگ چراغ علی۔ جلد چہارم حالی ذکاءاللہ کے نام سے منسوب ہیں۔

جناب ایڈیٹر صاحب اُردو اگر اس معمے کو آپ حل کردیں تو اس کے معاوضے میں ایک سال کے لئے رسالہ اُردو کو کسی شوقین ادب طالب علم کے نام مفت جاری کرنے کے لئے چندہ حاضر کروں گا!۔

ان سطور تک الفہرست کے جن حقائق و خصائص پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اُن سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس مجموعۂ خوبی ہائے بے کراں کے کارناموں کی وضاحت انہیں نمبروں میں محدود ہے۔یہ تو چند اور سرسری نمونے ہیں جو مبصرین حقیقت کے سامنے بطور مثال پیش کئے گئے ہیں۔ورنہ یہ سلسلۂ نامتناہی کرۃ بعد اولی و مرۃ بعد اخری برابر چلا گیا ہے۔جس عنوان پر نظر ڈالئے ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست۔ان بدیہیات کے بعد جن باتوں کا پیش کرنا مقصود ہے وہ اگرچہ قیاسات پر مبنی ہوں گی مگر ایک وسیع النظر ماہر سمجھ سکے گا کہ یہ قیاسات مع الفارق نہ ہوں گے۔ جن کو حسب ذیل عنوانات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) الفہرست کس طرح مرتب کی گئی ھے اور اس میں ایسی بے ترتیب لغزشیں کیوں رہ گئیں —

(۲) جس قدر تعداد کتب اس فہرست میں دکھائی گئی ھے - معمولی اخبار بیں باخبر علم الاعداد سے یہ ثابت کرسکتا ھے کہ اس تعداد سے بہت زیادہ کتابیں بآسانی مل سکتی تھیں —

(۳) ایک دو نہیں درجنوں نہیں بلکہ سیکڑوں اور مبالغہ نہ سمجھا جاے تو ہزاروں مطبوعہ (اُردو) کتابیں اس فہرست میں مندرج نہیں جن کی طباعت اس کی اشاعت سے بہت پہلے عالم وجود میں شہرت پزیر ہوچکی ھے —

(۱)

ترتیب کی بے ربطی اور عنوانوں کی عدم خانہ پری بتارھی ھے کہ عموماً کسی بک ایجنسی کی فہرست سے کتابوں کے نام لکھے گئے ھیں - یہ قیاس اس لیے علم الیقین بلکہ حق الیقین کا مرتبہ پا سکتا ھے کہ ایک مرتب فہرست جو کافی قابلیت تدوین رکھتا ہو اصل کتاب کو پاکر ممکن نہیں کہ اس کے مصنف کا نام اور صفحات کی تعداد معلوم نہ کرسکے - ظاہر ھے کہ دکان داروں کی فہرستیں بکثرت صرف کتابوں کے ناموں اور قیمت کو بتاتی ھیں نہ کہ عموماً مصنفین کو - اس دعوے کی دلیل میں صفحہ ۲۵۳ کے عنوان سوانح عمری کو دیکھا جاے - جس میں (۵۱۷) کتابیں مندرج ھیں - مگر (۳۰۰) کتابیں ایسی ھیں جن کے مولف نامعلوم اور قیمت معلوم - یہی صورت ناول کی فہرست میں ھے کہ (۶۰۰) سے زیادہ کتابوں کے اسما درج ھیں - لیکن مجموعتاً (۱۹) صفحے ایسے ھیں جن میں بجز قیمت اور پتے کے کوئی نشان نہیں - اب رہیں وہ کتابیں جن کے مصنفین کے نام موجود ھیں تو ان میں بعض ایسی ھیں جن کے مصنف شہرت یافتہ ھیں اور اشتہاری کتب فروش فروغ تجارت کے لیے ان کے نام بھی لکھہ دیتے ھیں اسی کی نقل کافی سمجھی گئی - اور بفرض اگر کسی چھوٹے موٹے مقامی کتاب خانے سے چند کتابیں لی گئی ھیں تو ان کے اندراج کی یہ شان نہیں ہو سکتی - ایسی فہرست کے مدون کا معمولی فرض تھا کہ واقفت عامہ کے لیے خانۂ کیفیت میں اس کتب خانے کا حوالہ دیا جاتا - ان کھلی ہوئی چشم پوشیوں کو دیکھہ کر ایسی لغزشوں کا سبب اس کے سوا کیا ہو سکتا ھے کہ جس کتب خانے سے فہرست کتب لی گئی ھے اس کو کسی ایسے کم علم اور مجہول الحافظہ سے لکھوایا گیا ھے جسے اپنی قابلیت و یادداشت پر اعتماد نہ تھا - بکثرت دیکھا جاتا ھے کہ کتب خانوں میں بعض مجلدات متعدد جمع ہو جاتی ھیں - ناقل ناعاقل نے فہرست لکھتے وقت

اس کا خیال بھلا دیا کہ یہ نقل ملک کے سامنے پیش ہونے والی ہے-الماریوں میں جتنی کتابیں ملیں بلا استثناء مکررات ان کو لکھہ لیا اور پھر وہی مسودہ مکھی پر مکھی مارنے کے لئے کاتبان مطبع کے حوالے کردیا گیا-اگر کتابوں کا دیکھنے والا علمی ذوق سے نابلد نہیں اور وہ کتابوں کو محض اس لئے دیکھہ رہا ہے کہ ان کی ایک مکمل فہرست اہل علم کے ہاتوں تک پہنچانی ہے تو کیا کوئی غبی الذہن بھی اصل کتابوں کو پاکر تعداد صفحات اور اسماء مصنفین کو چھوڑ سکتا ہے-غرض کہ اکثر عنوانوں میں کتابوں کا مکرر درج ہو جانا اور اُردو و فارسی کا امتیاز نہ کرنا اور مصنفوں کے ناموں کا نہ لکھنا ان قیاسات کو یقینیات بنانے کے لئے کافی ضمانت کر رہا ہے—

(۲)

اس بات کے ثابت کرنے سے پہلے کہ الفہرست میں مطبوعہ کتابوں کی تعداد بہت کم بتائی گئی ہے-ضرورت ہے کہ جس قدر مطبوعات اُس میں مندرج ہیں اُن کا شمار کیا جاے-اس مصیبت کے جھیلنے میں پھر لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے-یعنی مدون کی سہل انکاری اور بے پروائی سے ۸۱۵ صفحوں کی کتابوں کو گننا ہوگا-جب کہیں یہ عقدہ حل ہوسکے گا-بہر حال سنگ آمد و سخت آمد جمع و تفریق ضرب و تقسیم کے بعد جس عطر مجموعے کو تحصیل حاصل سمجھہ سکا وہ (۶۷۳۵) کے اعداد ہیں—

اُردو زبان کی ابتدائی اور تصنیف و تالیف کی تاریخ سے قطع نظر کرتے ہوئے عام اہل خبر جانتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط سلطنت سے اُردو زبان کی ترویج و اشاعت شروع ہوئی ہے اور فورٹ ولیم (کلکتہ) اور دہلی کی سوسائٹی (سنہ ۱۸۲۰ ع) کے وجود کے ساتھہ طباعت کتب کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا-اس سوا سو برس کی مدت طویل میں رفتار مذاق دیکھتے ہوئے بالاوسط کس قدر کتابیں چھپنی چاہئیں ؟ اس کا سرسری اندازہ اُس یاد داشت سے کرنا چاہئے جس کو جنوری سنہ ۱۹۲۱ ع کے رسالۂ زمانہ (کان پور) نے اُردو کی قلت اشاعت پر افسوس کے ساتھہ ثبت کیا-ہے وہ فقرہ یہ ہے:- " ستمبر سنہ ۱۹۲۰ ع کی سہ ماہی میں ۷۲ کتابیں اُردو میں چھپی ہیں-" اگر اسی سرمایۂ اشاعت پر کفایت و قناعت کی جائے تو سوا سو برس میں ۳۰ یا ۴۰ ہزار کتابیں شایع ہونی چاہئیں-لیکن مدون الفہرست نے اس قلیل تعداد اوسط کو بھی اتنا گھٹایا ہے کہ اگر مذکورۂ بالا شمار کو صفر (۰) کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا—

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

راقم حروف کا یہ قیاس و گمان بھی علم الیقین اور حق الیقین سے کم نہیں جس کے لئے قطعی ثبوت و دلیل سنہ ۱۹۰۵ ع کی مردم شماری کی وہ رپورٹ ھے جس کا خلاصہ اگست سنہ ۱۹۰۵ ع کے زمانے میں بایں الفاظ شایع ھوا ھے:—

"مردم شماری ھند کی رپورٹ میں ھندوستانی زبانوں کے متعلق جو یاد داشت لکھی گئی ھے اُس کا خلاصہ یہ ھے کہ سنہ ۱۹۰۵ ع تک اُردو ادب میں (۱۶۳۹۵) کتابیں شایع ھوئی ھیں اور مخصوص بخط اُردو (۱۰۸۷۹) چھپی ھیں۔ اتنی اشاعت کسی دوسری زبان میں نہیں"

سب جانتے ھیں کہ ایک مردم شماری سے دوسری مردم شماری تک دس برس کا زمانہ ھوتا ھے۔ الفہرست سنہ ۱۹۰۳ و ۱۹۰۴ کی مردم شماری کے بعد دوسری مردم شماری کے لگ بھگ حسب بیان مؤلف دامن ترتیب میں گل اندازی شروع کر چکی تھی اور تیسری مردم شماری (سنہ ۱۹۲۱ ع) تک اپنی پر دامنی سے اس گلزار کو سدا بہار بنا چکی تھی مگر افسوس ھے کہ باوجود ذرائع معلومات مردم شماری کی رپورٹ دیکھنے کو بھی کسی بڑے کتب خانے کی سیر کا مترادف سمجھا گیا—

(۳)

اس نمبر میں لفظی تمہید و تشریح زیادہ نہو گی بلکہ صرف یہ بتا کر کہ الفہرست کی ترتیب سنہ ۱۹۲۳ ع میں ختم کی گئی ھے۔ اس سے پہلے یعنی سنہ ۱۹۲۲ ع تک جتنی کتابیں اُردو میں شایع ھوچکی ھیں ان میں سے چند نام ایسے پیش کئے جائیں گے جن کا پتا نشان الفہرست میں نہیں اور اسی کے ساتھ یہ بتا دینا بھی ترفع بے محل نہ ھوگا کہ یہ کتابیں راقم الحروف کے حقیر کتب خانہ میں موجود ھیں۔ اگر جناب مرزا صاحب کو حیدرآباد سے باھر جانے کی اجازت حاصل نہیں ھوئی تو بھی ممکن اور بہت ممکن تھا کہ اگر خاص بلدۂ فرخندہ بنیاد میں کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سر سالار جنگ بہادر اور دیگر اھل مذاق کے کتاب خانوں امعان نظر سے دیکھتے تو اُن کتابوں سے چوگنا مجموعہ جمع ھو جاتا۔ میرا ذاتی تجربہ و مشاھدہ ھے کہ اِس گئے گزرے زمانے میں بھی حیدرآباد میں کتابی سرمایہ کافی تعداد میں موجود ھے بشرطیکہ کوئی ڈھونڈھنے والا نیاریا بن کر چھان بین کرے۔ جس صورت میں یہ فہرست

پیش کی گئی ہے افسوس کہ اُس کی کوئی حیثیت نظر میں نہیں جچتی۔عنوان۔ خانہ پری۔کاغذ۔طباعت وغیرہ وغیرہ جس چیز کو دیکھا جاتا ہے نقص سے خالی نہیں۔کاش بانکی پور لائبریری کی مطبوعہ فہرست ھی سے مدد لی گئی ہوتی تو غالباً کتابوں کی تعداد میں اتنی کمی اور خانہ پری میں اس قدر سادگی نظر نہ آتی۔راقم حروف اگرچہ اس وقت تک مرزا صاحب کے تعارف ظاہری سے فیض یاب نہیں مگر اُردو کے سلسلۂ خدمت کی بدولت بکثرت نہ سہی تو بقلت ان کی قابلیت سے آگاہ ہے۔جس مفید ضروری اور مہتم بالشان کام کو انہوں نے اپنے ذمے لیا تھا وہ ہر طرح اُن کے لئے شایان شان تھا مگر حیرت ہے کہ ایسے کارنامے کو جس چار جامے کے ساتھہ حلیۂ انطباع بخشا گیا ہے اُس کی کسی ادا میں کوئی حسن نہیں پایا جاتا۔

اب میں اپنے مجوزہ عنوانی نقشہ کے ساتھہ بغیر ترتیب فن چند کتابیں پیش کرکے رخصت ہوتا ہوں:۔

(نقشہ صفحہ آیندہ پر ملاحظہ ہو)

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۱	ریاض الانوار حصہ اول	تذکرۂ اولیا	حافظ محمد عمر دہلوی	۱۳۰۰ھ	۳۰۸	نصرت المطابع دہلی	۱۳۰۲ھ	
۲	ایضاً جلد دوم	تذکرۂ اولیا	حافظ محمد عمر دہلوی	۱۳۰۰ھ	۱۰۸	حدیقۃ العلوم میرٹھ	۱۳۰۵ھ	
۳	تاریخ بلگرام ۲ حصہ	تاریخ	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	۱۳۰۱ھ	۱۷۲	نورالانوار آرا	۱۳۰۱ھ	
۴	عقد ثریا	عملیات	سید عابد حسین لکھنوی	۱۳۰۳ ۱۸۸۲ع	۵۵	نولکشور لکھنؤ	۱۳۰۳ ۱۸۸۲ع	
۵	سخن بے مثال دیوان شاد لکھنوی	دیوان	شیخ محمد جان شاد	۱۳۱۰ھ ۱۸۹۳ع	۱۷۳	تصویرعالم پریس لکھنؤ	۱۳۱۸ھ	
۶	گوہر آبدار	دیوان	منور خاں گوہر مدراسی	۱۳۲۳ھ	۷۲	مطبع سلطانی مدراس	۱۳۲۳ھ	
۷	اُردو کا گلدستہ	نظم	سید امجد علی اشہری	۱۹۰۵ع	۷۲	مطبع آگرہ اخبار	۱۹۰۵ع	
۸	جلوۂ کائنات	اخلاق	مولوی عبدالرحمن کلیانی		۲۰	کریم المطابع بجنور	*	* سنہ اشاعت اصل کتاب میں نہیں ہے مگر یہ مصنف اسی زمانے کے ہیں
۹	نہال روضہ اکبر (رحمت پیغمبر)	دیوان نعت	محمد اکبر خاں اکبر میرٹھی	۱۳۲۰ ۱۹۰۲ع	۸۰	نامی پریس میرٹھ	۱۳۲۰ھ	
۱۰	دیوان افسر	دیوان	بشیرالدین افسر اورنگ آبادی	۱۳۱۱ھ	۷۳	مطبع خیبر اورنگ آباد دکن	۱۳۱۲ھ	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۱۱	مناصرہ	نظم منقبت	حافظ منیرالدین ضیا	۱۳۲۳ھ	۲۲	مفید الاسلام حیدرآباد-دکن	۱۳۲۳ھ	
۱۲	تضمین بے بہا	نظم	پتیمبر پرشاد اختر اجمیری	۱۹۰۳ع	۴۸	مطبع رضوی دہلی	۱۹۰۳ع	
۱۳	گلزار سخن	ادب شاعری	جگناتھہ پرشاد فیض کھنڈوا	۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ع	۶۶۸	نولکشور لکھنؤ	۱۳۲۶ھ	
۱۴	تاریخ بدیع	مثنوی	امیراللہ تسلیم	۱۲۹۸ھ ۱۸۸۱ع	۳۵۴	مطبع حسنی رامپور	۱۲۹۸ھ	
۱۵	کان تاریخ	صنایع تاریخ	رام پرشاد شاہجہان آبادی	۱۲۹۴ھ	۱۶۰	مطبع انوری آگرہ	۱۲۹۴ھ	
۱۶	کلام مہر	نظم	سورج نرائن مہر	۱۹۰۸ع	۴۳۲	مفیدعام لاہور	۱۹۰۸ع	
۱۷	صفیر بلبل	دیوان	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	۱۲۷۳ھ		عظیم المطابع پٹنہ	۱۲۸۰ھ	
۱۸	ارمغان عزیز	دیوان	نواب عزیزیار جنگ	۱۳۳۶ھ	۲۲۵	شوکة المطابع حیدرآباد دکن	۱۳۳۶ھ	
۱۹	آثارالشعرا	تذکرہ شعرا	سید ممتاز علی بھوپالی	۱۳۰۴ھ	۲۹۹	مطبع شاہجہانی بھوپال	۱۳۰۷ھ	
۲۰	کلیات شیفتہ و حسرتی *	دیوان	نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ	۱۸۶۹ع	۱۲۴	نظامی پریس بدایوں	۱۹۱۶ع	
۲۱	تذکرة الصلحا (تاریخ احسن)	تاریخ	مولوی عبدالحی بدایونی	۱۳۳۰ھ	۶۶	ایضاً	۱۳۳۰ھ	

* یہ کلیات الفہرست میں نہیں بلکہ الناظر کا چھپا ہوا ناکافی تفصیل کے ساتھہ لکھا گیا ہے —

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۲۲	کیفیت تشریف آوری امیر کابل	تاریخ	مسلمانان مدرسۃ العلوم علی گڈہ	۱۹۰۷ع ۱۳۲۴ھ	۴۵	انستیٹیوت پریس علیگڈہ	۱۹۰۷ع	
۲۳	سالانہ رپورٹ جائداد مدرسۃ العلوم علی گڈہ	تاریخ	کارکنان مدرسۃ العلوم علی گڈہ	۱۹۱۲ع	۴۳	ایضاً	۱۹۱۲ع	
۲۴	خطبات الاسلام للجمعہ والایام العظام	فقہ	مولوی یونس خاں دتاولی علی گڈہ	۱۳۳۰ھ	۳۲	مطبع احمدی علیگڈہ	۱۳۳۰ھ	
۲۵	چراغ سخن (رسالہ عروض)	عروض	مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی	۱۹۱۵ع	۹۶	گلشن ابراہیمی لکھنو	۱۹۱۵ع	
۲۶	رسالہ کانفرنس نمبر ۷	لکچر	صاحبزادہ آفتاب احمد خاں	۱۹۱۱ع	۷۶	ریاض ہند علیگڈہ	۱۹۱۱ع	
۲۷	محاربات ترک باطالیہ	مسدس (نظم)	غلام حضرت خاں حاذق	۱۹۱۳ع	۴۸	نولکشور لکھنو	۱۹۱۳ع	
۲۸	تاریخ جدید صوبہ اُڑیسہ	تاریخ	سید اولاد حیدر فوق بلگرامی	۱۹۱۵ع	۴۱۶	مطبع اکبری پٹنہ	۱۹۱۵ع	
۲۹	سر المکنون ترجمہ سر العالمین	اخلاق	سید یسین علی حسن نظامی	۱۳۲۹ھ	۲۰۴	رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور	۱۳۲۹	
۳۰	قانون تصوف حصہ اول	تصوف	منیجر انجمن خدام الصوفیہ لاہور	۱۳۲۲ھ	۴۰	فیض عام لاہور	۱۳۲۲ ۱۹۰۴ع	
۳۱	کنز التاریخ	تاریخ	مولوي رضی الدین بدایونی	۱۳۱۹ھ	۴۱۲	نظامی پریس بدایوں	۱۹۰۷ ۱۳۱۹	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانه مصنف	تعداد صفحه	مطبع	سنه اشاعت	کیفیت
۳۲	تاریخ فرخ آباد ۲ حصه	تاریخ	ولیم آروین سی ایس فتح گڈه		۳۶۱	*		*
۳۳	تذکرة الانساب	تذکره اولیا	مولوی سید امام الدین گلشن آبادی	۱۳۲۲ھ	۱۶۰	افضل المطابع دهلی	۱۳۲۲ھ	اصل کتاب پر مطبع وغیره کا نام نهیں هے—
۳۴	دیوان اول یاس	دیوان	میر ذاکر حسین یاس لکهنوی	۱۲۹۲ھ	۲۳۰	قومی پریس لکهنو	۱۳۰۶ھ	† الفهرست میں صرف مرتبه آزاد درج هے—
۳۵	قواعد منتخب	قواعد اُردو	سید ضامن علي جلال لکهنوي	۱۳۰۴ھ	۳۲	مطبع قومی لکهنو	۱۳۱۰ھ	
۳۶	گلدسته معرفت	مثنوي	نواب صفدر علی خاں رامپوری	۱۳۰۹ھ		مفید عام آگره	۱۳۱۰ھ	
۳۷	دیوان ذوق †	دیوان	شیخ محمد ابراهیم ذوق	۱۲۶۰ھ	۹۶	مطبع نامی لکهنو	۱۸۹۲ع	‡ الفهرست میں صرف مرتبه نظامی و حسرت درج هے حالانکه مرزا غالب کے دیوان بکرات ومرات چند بار شایع هو چکے هیں—
۳۸	دیوان غالب ‡	ایضاً	اسدالله خاں غالب	۱۲۸۱ھ	۷۲	ایضاً	۱۳۰۸ھ	
۳۹	مظهر عشق	ایضاً	ارشد علی خاں قلق	۱۲۸۹ھ	۲۰۲	نولکشور کانپور	۱۳۲۹ھ	
۴۰	نظم دلفریب	ایضاً	شاه نذرالرحمن حفیظ عظیم آبادی	۱۳۱۶ھ	۴۰۷	احسن المطابع پټنه	۱۳۱۷ھ	
۴۱	چمنستان صفیر	نظم	حکیم علی حسین صفیر لکهنوی	۱۹۱۰ع	۴۸	مفید عام پریس لکهنو	۱۹۱۰ع	
۴۲	باغ خیال اکبر (دیوان اکبر)	دیوان	اکبر علی خاں افسوں و اکبر آگره $		۹۶	ابوالعلائی آگره		$ حال کے شاعر هیں—

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۴۳	ریاض نواس (کلام اطہر)	دیوان	غلام مصطفی خاں اطہر جل گانوں	۱۳۲۷ھ	۱۳۲	مطبع حقانی دھلی	۱۳۲۷ھ	
۴۴	نشتر سخن	تذکرہ شعرا	احسان اللہ عباسی	۱۹۱۱ع	۴۷۲	مطبع حکیم برھم وغیرہ	۱۹۱۱ع	
۴۵	آیات الاحکام	فقہ	مولوی عبدالعلی نگرامی	۱۲۶۲ھ	۲۱۸	مطبع علوی محلہ بلھرہ	۱۲۶۲ھ	
۴۶	الکلمۃ العلیا لاعلاء علم المصطفا	کلام	مولوی نعیم الدین مرادآبادی	۱۳۲۷ھ	۱۴۸	شمس المطابع مرادآباد	۱۳۲۷ھ	
۴۷	قصص العرب	تاریخ	ھادی حسین ھادی بنارسی	۱۹۱۰ع	۵۸	سلیمانی پریس بنارس	۱۹۱۰ع	
۴۸	انشاے جدید	انشا	عبدالسلام رفیقی	۱۹۰۸ع	۶۴	نظامی پریس بدایوں	۱۹۰۸ع	
۴۹	سفینۂ نوح	دیوان	محمد نوح نوح ناروی	۱۳۲۹ھ	۲۲۵	اسٹنڈرڈ پریس الہ آباد	۱۳۲۹ھ	
۵۰	میلاد معصومین	مراثی و منقبت	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	۱۹۱۴ع	۳۱۵	عزیزی پریس آگرہ	۱۹۱۴ع	
۵۱	دیوان حاذق	دیوان	منشی فخرالدین حاذق برھان پوری	۱۳۲۲ھ	۸۰	ابوالعلائی پریس آگرہ	۱۹۰۶ع	
۵۲	دیوان فروغ	دیوان	سید امیر حسین وکیل حیدرآباد - دکن	۱۳۲۵ھ	۲۵۳	گلشن فیض لکھنؤ	۱۹۰۷ع	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۵۳	گلگشت فرنگ (روزنامچہ نواب مہدی حسن خاں)	سفرنامہ	مترجمہ مولوی عزیز مرزا	۱۸۸۹ع	۲۳۶	مفید عام آگرہ	۱۸۸۹ع	
۵۴	ظہیر المومنین (مجموعہ احمدی)	فقہ شیعہ	سید آل احمد بلگرامی	۱۲۹۱ھ	۳۴۴	مطبع اعجاز محمدی آگرہ	۱۳۱۱ھ	
۵۵	کشف الحاجۃ ترجمہ مالا بدمنہ	فقہ اہل سنت	مولوی نورالدین	۱۲۶۲ھ	۹۶	سلطان المطابع لکھنؤ	۱۲۶۹ھ	
۵۶	تزک مرتضوی	حالات اولیا اللہ	مولوی حسن رضا خاں بریلوی	۱۳۰۰ھ	۲۴	مطبع جماعت تجارت بریلی	۱۸۸۳ع	
۵۷	سلسلہ دینیات ۷ حصہ	فقہ	کمیٹی دینیات اہل سنت مدرسۃ العلوم علیگڈہ	۱۹۰۳ع	مجموعۃ ۱۷۵	مطبع احمدی علی گڈہ	۱۹۰۳ع	
۵۸	ریاض نسیم	دیوان	سید شبیر حسین نسیم بھرتپوری	۱۹۰۹ع	۲۳۲	ابوالعلائی پریس آگرہ	۱۳۲۷ھ	
۵۹	گنجینہ اسرار الہی منتخبات بلدیشری	تصوف و اخلاق	بلدیشری پرشاد (خزانچی)	۱۸۹۴ع	۲۲۰	مطبع الہی آگرہ	۱۸۹۴ع	
۶۰	ازالۃ الوسواس عن صدور الناس	کلام	سید محمد احسن امروہوی ۳ حصہ	۱۹۰۴ع	۹۲	مطبع میرٹھ	۱۹۰۴ع	
۶۱	الطاعون	طب	حاذق الملک حکیم اجمل خان	۱۳۱۵ھ		*	۱۳۱۵ھ	
۶۲	مانع البدعات	فقہ دینیات	مولوی عالم علی	۱۲۶۴ھ	۵۲	مطبع قیصری پٹنہ	۱۳۰۰ھ	
۶۳	مولود شریف نبی کریم	مولود شریف	صاحب علی خان	۱۲۹۸ھ	۳۲	مطبع جلالی الہ آباد	۱۲۹۸ھ	

* جو کتاب دیکھی گئی اس کے اوراق آخر نہ تھے اس لئے صفحات و مطبع کا پتہ فی الحال نہ معلوم ہو سکا —

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۶۴	برہان لائح فی تحقیق امر الذمائح	فقہ	مولوی سید قمرالدین احمد	۱۲۹۲ھ	۱۵۴	مطبع نظامی کان پور	۱۲۹۲ھ	*بہارستان سخن کے نام سے ایک کتاب مطبوعہ نول کشور الفہرست میں درج ہے مگر وہ یہ کتاب نہیں ہے —
۶۵	بہارستان سخن *	دیوان	ناسخ و آتش و آباد لکھنوی	۱۲۶۳ھ	۲۵۶	مطبع محمدی لکھنؤ	۱۲۶۳ھ	
۶۶	حیات وارث	سوانح عمری	مرزا محمد منعم بیگ	۱۹۱۶ع ۱۳۳۴ھ	۷۲	مطبع حکیم برہم گورکھپور	۱۹۱۶ع	
۶۷	طلب صادق	ناول	حاجی محمد خاں خورجوی	۱۸۹۶ع	۱۰۴	خادم الاسلام پریس دہلی	۱۸۹۶ع	
۶۸	تہدید الغدوہ	مباحثہ	سید شاہ محمد حسین پٹنوی	۱۳۱۵ھ	۵۰	مطبع حنفیہ پٹنہ	۱۳۱۵ھ	
۶۹	تواریخ مہین	قطعات تاریخ نظم	سید محمد مہدی کمال لکھنوی	۱۳۲۲ھ	۵۴	مطبع تصویر عالم لکھنؤ	۱۳۲۲ھ	
۷۰	حدیقۂ شہدا +	حالات بزرگاں	مرزا جان لکھنوی	۱۲۷۲ھ	۷۰	مطبع قدیم لکھنو	۱۲۷۲ھ	+ ذکر جہاد مولوی امیرالدین علی
۷۱	سیف الاسلام	مباحثہ نصاریٰ	سید فتح علی بخاری	۱۲۸۷ھ	۳۰	لائٹ پریس بنارس	۱۲۸۷ھ	
۷۲	تصدیق الاسلام	مباحثہ نصاریٰ	سید فتح علی بخاری	۱۲۸۷ھ	۳۸	لائٹ پریس بنارس	۱۲۸۷ھ	
۷۳	هشت کونسل (دربہا)	مباحثہ نصاریٰ مناظرہ	حکیم محمد حسن امروہوی	۱۲۹۱ھ	۳۲	مطبع مجتبائی دہلی	۱۲۹۱ھ	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۷۶	هفت جلسه	مناظره	نعمان خاں وکیل	۱۲۹۳ھ	۲۴	انوار محمدی راے بریلی	۱۲۹۳ھ	
۷۷	معلم الحساب معروف بہ مکتب نامہ	حساب	مولوی مسیح الزمان		۱۸۸	مطبع مسیحائی لکھنو *		* قدیم چھاپہ غدر سے پہلے کا ھے اس نام کی جو کتاب الفہرست میں درج ھے وہ کوئی اور ھے —
۷۸	رشحات صفیر	قواعد	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	۱۲۹۳ھ	۲۹۲	مطبع نور الانوار آرہ	۱۲۹۳ھ	
۷۹	گلشن منن	دیوان	مرزا فدا علی منن لکھنوی	۱۳۲۷ھ	۳۲	مطبع فیض احمدی لکھنو	۱۳۲۷ھ	
۸۰	عدد التاریخ	تاریخ گوئی	منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی	۱۳۲۰ھ	۳۳۶	مطبع نیر اعظم مراد آباد	۱۳۲۰ھ	
۸۱	الفاروق	سوانح عمری	شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی	۱۸۹۹ع	۳۱۲	نامی پریس کان پور	۱۸۹۹ع	
۸۲	عجائبات امریکہ	سفر نامہ	منشی الہ دت سیالکوت	۱۸۹۵ع	۲۰۸	پنجاب پریس سیالکوت	۱۸۹۵ع	
۸۳	فاطمی دعوت اسلام	تاریخ	مولوی حسن نظامی	۱۳۳۸ھ	۴۴۰	مطبع دهلی *	۱۹۲۰ع	* مطبع کا نام اصل کتاب میں پڑھا نہیں گیا —
۸۴	واقعات انیس	سوانح	حکیم مہدی حسن احسن لکھنوی	۱۹۰۸ع	۲۴۴	اصح المطابع لکھنؤ	۱۹۰۸ع	
۸۵	مینا ے سخن	واسوخت	منشی امیر احمد امیر مینائی	۱۳۱۶ھ	۱۷۵	دائرۂ ادبیہ لکھنؤ	۱۹۲۱ع	
۸۶	جامع القواعد	صرف و نحو	موتی رام مناگر	۱۹۲۱ع	۲۹۷	مفید عام پریس لاهور	۱۹۲۱ع	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۸۷	معین الشعرا	قواعد شاعری	میر محمد علی خان ناظم	۱۳۲۳ھ	۱۱۲	مطبع صاحب دکن حیدر آباد	۱۳۲۳ھ	
۸۸	تاج سخن	دیوان	حافظ جلیل حسن جلیل	۱۹۱۰ع	۳۶۴	مطبع اختر دکن حیدر آباد	۱۹۱۰ع	
۸۹	جان سخن	دیوان	حافظ جلیل حسن جلیل	۱۳۳۴ھ	۲۶۶	امیر المطابع حیدر آباد - دکن	۱۹۱۶ع	
۹۰	دیوان وحشت	دیوان	رضا علی وحشت کلکتہ	۱۳۲۷ھ	۱۴۷	مطبع ستارۂ ہند کلکتہ	۱۳۲۸ھ	
۹۱	رسالہ عقیقہ	فقہ	محمد نظام	۱۲۷۸ھ	۲۴	مطبع نظامی کانپور	۱۲۷۸ھ	
۹۲	تنبیہ الجہال بالہام الباسط الستعال	مناظرہ	مولوی حافظ بخش	۱۲۹۱ھ	۱۰۴	مطبع بہارستان کشمیر لکھنؤ	۱۲۹۲ھ	
۹۳	دیوان مجروح	دیوان	میر مہدی حسن مجروح دہلوی	۱۸۹۹ع ۱۳۱۶ھ	۲۴۸	سرفراز پریس دہلی	۱۸۹۹ع	
۹۴	دیوان عزیز	دیوان	مولوی حافظ عبد العزیز خاں بریلوی	۱۸۹۳ع ۱۳۱۱ھ	۲۶۴	مطبع شوکت الاسلام لکھنؤ	۱۸۹۳ع	
۹۵	کاشف الحقائق جلد دوم*	ادب شاعری	نواب امداد امام اثر		۵۳۹	کارونیشن پریس لکھنؤ		*اس کی پہلی جلد بھی چھپ چکی ہے —
۹۶	میخانۂ بیخود	دیوان	عبد الحی بیخود بدایونی	۱۳۱۳ھ	۳۰۰	مستنصر پریس دہلی	۱۹۱۰ع	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۹۷	روضۃ الکرام شجرۂ سادات بلگرام	انساب	سید وصی الحسن بلگرامی	۱۹۲۰ع	۲۳۶	مطبع حکیم برہم گورکھپور	۱۹۲۰ع	
۹۸	حل غوامض	لغت	مولوی سید محمد عبداللہ بلگرامی	۱۸۸۶ع	۲۵۲	مطبع احمدی کان پور	۱۸۸۶ع	
۹۹	موازنہ انیس و دبیر*	تذکرہ	مولوی شبلی نعمانی	۱۹۱۰ع	۲۸۴	انوارالمطابع لکھنؤ	۱۹۲۱ع	* یہ تیسرا ایڈیشن ہے —
۱۰۰	المیزان	تذکرہ	سید نظیر الحسن رضوی	۱۹۱۲ع	۶۱۰	فیض عام علیگڈہ	۱۹۱۲ع	
۱۰۱	دیوان غالب جدید نسخۂ حمیدیہ	دیوان	مولف مفتی انوارالحق	۱۹۲۱ع	۳۴۲	مفید عام آگڈہ	۱۹۲۱ع	
۱۰۲	جلوۂ خضر حصۂ اول	تذکرہ	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	۱۳۰۲ھ	۳۰۸	نورالانوار آگرہ	۱۸۸۵ع	
۱۰۳	ایضاً حصۂ دوم	تذکرہ	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	۱۹۰۲ع	۲۸۴	نورالانوار	۱۸۸۵ع	
۱۰۴	شرح دیوان غالب	دیوان	مولوی سید علی حیدر طباطبائی	۱۹۰۸ع	۳۴۸	مفید الاسلام حیدرآباد-دکن	۱۹۰۸ع	

جہاں تک امکان کی معمولی حد تھی الفہرست کے اوراق ایک ایک کتاب کے مقابلے کی غرض سے اُلٹے پلٹے گئے ہیں۔اتنی ورق گردانی کے بعد بھی اگر کوئی کتاب اس نمونے میں ایسی درج ہوگئی ہو جس کا وجود الفہرست میں موجود ہے تو راقم حروف کو انسان سمجھا جائے نہ فرشتۂ آسماں—

یہ چند کتابیں محض نمونے کے لئے پیش کی گئی ہیں جن میں ہر قسم اور ہر فن کی چھوٹی بڑی کتابیں موجود ہیں اگر خاکسار صرف اپنے چھوٹے سے کتب خانے ہی کی فہرست پیش کرے تو بلا مبالغہ الفہرست کی ایک چہارم ضخامت درکار ہوگی جس کے لئے نہ اب رقت ہے نہ اس نمونے کے صحیح مان لینے پر آئندہ ضرورت۔ بالاخر اس شعر پر خاتمہ ہے—

داماں نگہ تنگ وگُل حسن تو بسیار
گُلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

احسن مارہروی
اُردو لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج
مسلم یونیورسٹی۔علی گڈہ

گوہرین نامہ

مولوی احسن اللہ خاں ثاقب پروفیسر عربی و فارسی وکٹوریہ کالج گوالیار ادبی دنیا میں دیرینہ روشناس ہیں اور یہ گوہرین نامہ عربی فارسی۔ اُردو میں آپ کے خیالات و مقالات۔مکتوبات اور کلام نظم کا مجموعہ ہے اکثر اصناف سخن پر حاوی اور تنوع مضامین کے لحاظ سے دل چسپ۔نیز بعض ادبی و علمی معلومات کے لحاظ سے مفید و پر لطف ہے۔ ثاقب صاحب کی عمر اس وقت ۶۲ سال کی ہے۔آپ کو ہمیشہ ادبی ذوق اور ادبیات سے دل چسپی رہی۔ہندوستان و ایران کے اکثر نامور ہم عصر شعراء و ادباء سے دل چسپ و پر لطف صحبتیں رہیں اور اکثر و بیشتر نے اعتراف قابلیت کیا ہے۔آپ کی زندگی کے قابل ذکر کارناموں میں رسالہ قند پارسی ہے جو ماہانہ علی گڈہ سے

نکلتا رہا۔اُردو میں مکتوبات امیر مینائی مشہور تالیف ہے۔دیوان فارسی ہنوز طبع نہیں ہوا۔حاشیۂ اصطرلاب دیوبند کے مشہور مدرسۂ عربیہ میں داخل نصاب ہے۔دیباچۂ انتخاب دیوان فیضی فیاضی۔شرح حسن و عشق عالی شیرازی بھی قابل تذکرہ ہیں—

گوھرین نامہ میں صفحہ ۱۴ سے ۳۴ تک مکتوبات فارسی ہیں جو مولف نے سنہ ۱۸۹۴ع سے سنہ ۱۹۱۶ع تک مختلف احباب کو لکھے۔جن میں قدیم فارسی انشاپردازی کی شان پوری طور پر نمایاں ہے۔پھر ۱۲۳ صفحہ تک مختلف تقریظیں۔خطبات۔دو تین مضامین اور کچھہ وہ خیالات و واردات ہیں جو وقتاً فوقتاً بعض کتابوں کے دیکھنے یا کسی اور محرک کے وجہ سے پیدا ہوئے اور بیاض میں ٹانک لئے گئے تھے۔یہ حصہ بہت دل چسپ اور جدت کا پہلو لئے ہوے ہے۔اس سے مولف کے صحیح خیالات و جذبات۔بعض کتب اور اشخاص کی نسبت رائے۔معاصرین و احباب سے مراسم و تعلقات وغیرہ کا پتہ چلتا ہے اور یہ کہ مولف صاحب کی ملاقات ہندوستان کے کن کن بزرگوں سے کن کن مقامات میں ہوئی ہے—

صفحہ ۱۱۴ سے ۱۳۷ تک حصۂ نظم فارسی ہے۔اس میں قصائد۔قطعات۔غزلیات وغیرہ ہیں اور کلام کی پختگی۔سلاست ذوق اور متانت بیان ہر جگہ نمایاں ہے پھر چند عربی مکتوبات ہیں۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ قدیم طرز کے اچھے خاصے ادیب ہیں۔اِن سب کے بعد کچھہ اُردو مکتوبات۔دو ایک مضامین پھر چند دیباچے ہیں جو مولف صاحب نے بعض کتب پر لکھے ہیں۔اس کے بعد اُردو کلام ہے جس میں غزلیں زیادہ ہیں۔اگرچہ ثاقب صاحب کا اصل ذوق فارسی ہے۔اُردو میں بہت کم لکھا اور کہا ہے۔مگر جو کچھہ کہا اور لکھا ہے اس میں بھی پختگی بیان۔صحت زبان۔سلاست ذوق۔متانت و سنجیدگی کا عنصر اُبھرا ہے۔بہر حال یہ مجموعہ دیکھنے کے قابل ہے۔اس سے مولف کی تینوں زبانوں میں قابلیت۔مولف کے رجحان طبیعت۔ذوق ادب اور سوانح زندگی۔جذبات و خیالات سب کچھہ معلوم ہوتے ہیں۔آخر کتاب میں مولف کے نام ہندوستان و ایران کے مشاہیر کے چند مکتوبات تینوں زبانوں میں ہیں۔جن سے ان بزرگوں سے ثاقب صاحب کے مراسم محبت اور ثاقب صاحب کی نسبت ان کی رائیں اور اعتراف قابلیت کا اظہار ہوتا ہے اور یہی شاید ان کو شامل کرنے کا منشاء بھی ہے۔ان بزرگوں میں مولانا حالی۔شبلی۔وقار الملک مرحوم۔حکیم اجمل خاں۔مولانا عمادی۔اڈیٹر چہرہ نما مصر۔ایران۔اصفہان اور شیراز کے بعض اڈیٹروں کے

خطوط ھیں - گویہ سب ذاتی (پرائیوٹ) ھیں اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شایع ھوں گے تاھم ان سب میں کچھہ نہ کچھہ دل و دماغ کے لئے سامان تفریح و دلچسپی موجود ھے —

گوھرین نامہ کی لکھائی چھپائی کاغذ بہت معمولی ھے - حجم ۲۱۴ صفحے قیمت صرف ۱ روپیہ ۴ آنہ غالباً مولف صاحب یا محمد حسن صاحب علوی مالک انوارالمطابع لکھنؤ سے ملے گا —

(م)

———:o:———

مثنوی اسرار ھستی

(اس کے مصنف سید ضامن حسین صاحب گویا جہان آبادی
تلمیذ جناب حافظ پیلی بھیتی ھیں)

یہ مثنوی مضامین حقیقت و معرفت پر مشتمل ھے اور بصائر کے عنوان سے یوں شروع ھوتی ھے :—

چمن میں ھے کیا بہار دیکھو — چمن ھے کیا لالہ زار دیکھو
نکلتی ھے دل سے خود بخود واہ — زبان کہتی ھے اللہ اللہ
وہ خوشنوا ھیں طیور گویا — وہ پیارا پیارا ھے اُن کا نغمہ
کہ محو ھو جائے سننے والا — رھے نہ کچھہ ھوش تن بدن کا
یہ پھول پتے مہکنے والے — یہ بیل بوتے طرح طرح کے
کھلائے کس نے اگائے کس نے — دکھائے کس نے سنگھائے کس نے
یہ چھوتی چڑیاں چھکنے والی — یہ ننھی کلیاں مہکنے والی
چھک رھی ھیں مہک رھی ھیں — پھدک رھی ھیں چٹک رھی ھیں

آگے چل کر مسائل وحدانیت - وحدت وجود - سوفسطائیت - مادیت - ثنویت (بت پرستی) اور تثلیث پر اپنے خیالات ظاھر کئے ھیں - پھر ان پر تبصرہ ھے - وجدانی باتیں اور حقیقت خداشناسی وغیرہ پر عمیق مضامین ھیں - آخر میں عروس وحدت اور تبسم کے عنوان سے دو نظمیں ھیں —

جناب گویا کا کلام بے عیب - زبان عمدہ - بیان دل کش ھے - ضخامت ۴۸ صفحے تقطیع چھوتی ۲۰ × ۱۶/۳۰ لکھائی چھپائی عمدہ اور کاغذ نفیس قیمت کہیں درج نہیں - مولوی سید ضامن حسین صاحب گویا محلہ احمدزئی پیلی بھیت سے مل سکتی ھے —

(م)

شراب عیش

یہ ناول قاری سرفراز حسین صاحب دھلوی کی تازہ ترین تصنیف ھے۔ قاری صاحب ایک عرصہ سے ان معاشرتی پیچیدگیوں کا مطالعہ کر رھے ھیں جو طبقۂ طوائف کے بدولت آئے دن ھماری سماج میں پیدا ھوتی رھتی ھیں۔خالص اسی موضوع پر وہ پانچ افسانے سعید۔سعادت۔شاھد رعنا۔سزاے عیش اور انجام عیش لکھہ چکے ھیں اور زیر تبصرہ افسانہ اسی "سلسلۃ الطوائف" کی چھٹی کڑی ھے—

طوائف اور ان کے حالات زندگی کو بطور موضوع تحریر یا تقریر میں پیش کرنا شرفاء کے طبقہ میں جیسا کچھہ معیوب سمجھا جاتا ھے محتاج بیان نہیں۔یہی وجہ ھے کہ اس بدنصیب گروہ کی زندگی۔اس کی تنظیمات اور روایات پر آج تک پردہ پڑا ھوا ھے اور ان چیزوں کی واقفیت کے بغیر نوجوانوں کی حالت درست کرنا اور اس قابل رحم طبقۂ کی اصلاح کرنا دشوار ھے۔مبتذل اور عامیانہ مباحث سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو ان لوگوں کی زندگی کے ایسے مسائل سامنے آتے ھیں جن پر سنجیدگی کے ساتھہ خالص معاشرتی نقطۂ نگاہ سے بحث ھو سکتی ھے اور اصلاحی تجاویز پیش کی جا سکتی ھیں۔خوشی کی بات ھے کہ اس سلسلہ کی دوسری کتابوں کی طرح موجودہ کتاب بھی اسی مقصد کو سامنے رکھکر لکھی گئی ھے—

افسانے کی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو بھی کتاب کافی دلچسپ ھے۔ شریف خواتین اور طوائف دونوں کی صاف اور سچی تصویریں ھیں۔جو کچھہ بھی لکھا ھے قرین قیاس بنا کر لکھا ھے۔پلاٹ اگر زیادہ گہرا نہیں ھے تو بعید از حقیقت بھی نہیں ھے۔طوائف کی گفتگو۔ان کے طور طریقے اور چالوں کا بیان جس انداز سے کیا گیا ھے وہ جناب مصنف کے گہرے مشاھدہ کا ثبوت دیتا ھے۔ایک چیز جس سے ھمیں اصولاً اختلاف ھے یہ ھے کہ کہیں کہیں نفس قصہ کو چھوڑ کر کئی کئی صفحات نصائح اور تجاویز کی نظر کئے گئے ھیں۔جب مصنف اس طرح قصہ سے الگ ھٹکر نصیحت پر اُتر آتا ھے تو لطف باقی نہیں رھتا۔ مصنف کا فرض ھے کہ اپنی شخصیت کو ھمیشہ پس پردہ رکھے اور قصہ کو خود اپنے اخلاقی نتائج پیدا کرنے دے۔زبان پر کوئی اعتراض نہیں۔دلی کی صاف ستھری بول چال ھے البتہ کہیں کہیں انگریزی ساخت کے جملے نظر آتے ھیں جیسے:—

صفحہ ۴ (۱) "میں نے آپ کی اس زیادتی کو بھلا دیا کہ باوجود دوسرے شخص کو چاھنے کے آپ نے مجھہ سے بھی اظہار تعشق کیا جس کو میں اپنی غلطی سے سچ سمجھا"—

صفحہ ۴۲ (۲) "عشرت کو اپنے پیشہ کی جملہ روایات میں بہت تندھی کے ساتھہ پرورش کیا" ایک مقام پر لکھا ھے "بڑی طوائفوں سے رسائی ھے" ھماری راے میں "سے" کی بجاے "تک" زیادہ مناسب ھوتا—

سرورق رنگین-کاغذ لکھائی چھپائی غنیمت ھے-دفتر تمدن متیا محل دھلی سے دس آنہ میں مل سکتی ھے—

(و)

———:o:———

بہرام کی رھائی

ناظرین کو معلوم ھوگا کہ ظفر عمر صاحب نے ایک قصہ نیلی چھتری اور دوسرا بہرام کی گرفتاری کے نام سے لکھا تھا-ان دونوں قصوں کی خاصی شہرت ھو چکی ھے-یہ اس قصے کا بقیہ حصہ ھے جسے مرزا باقر حسن صاحب موزوں نے مکمل کیا ھے-مرزا صاحب نے کمال کیا ھے کہ اُسی رنگ میں اس قصے کا خاتمہ کیا ھے دل بہلانے کے لئے اچھی چیز ھے اور جو لوگ سراغ رسانی اور مجرم اور پولیس کے داو گھاتوں کو شوق سے پڑھتے ھیں اُن کی دلچسپی کے لئے یہ خوب کتاب ھے—

جنٹلمین بک ڈپو امین آباد لکھنؤ سے ایک روپیہ چار آنے میں مل سکتی ھے—

———:o:———

فطرت نسوانی

یہ کتاب مطبوعات صوفی کی ۶۹ ویں کڑی ھے-یہ اصل میں ایک فرانسیسی پروفیسر اخلاقیات ھنری مارین کی تصنیف ھے-عربی میں اس کا ترجمہ امیل زیدان صاحب اڈیٹر الھلال نے کیا تھا اور اب ملک کے مشہور اھل قلم مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے مذکورۂ بالا نام سے اُردو میں اس کا ترجمہ کیا ھے—

کتاب میں نسوانی مسائل پر بہت خوبی سے بحث کی گئی ھے-گزشتہ زمانہ میں عورت کا سماجی رتبہ اس کی جسمانی حالت-اس کی نفسیاتی خصوصیات اور پھر زمانہ جدید میں اس کی آزادی کی تاریخ-یہ سب باتیں بہت کچھہ تفصیل کے ساتھہ درج کی گئی ھیں اور ان لوگوں کے لئے سبق آموز ھوں گی جو عورت کی زندگی اور اُس کے مقصد پر غور و فکر کرتے رھتے ھیں—

ھمارے ملک میں عورتوں کی سماجی حیثیت کے متعلق-مختلف اور متضاد راے رکھنے والے دو گروہ ھیں-ایک گروہ وہ ھے جو صحیح معنوں میں "مغرب زدہ" ھے اور عورت کو ھر اعتبار سے مردوں کے برابر اور انھیں کی ذھنی اور اخلاقی صفات سے متصف خیال کرتا ھے اور زندگی کے ھر شعبہ میں انھیں صنف قوی کے دوش بدوش دیکھنا چاھتا ھے-دوسرا گروہ وہ ھے جو ھندوستان کے مخصوص سماجی ماحول سے اس حد تک متاثر ھوگیا ھے کہ تعلیم نسواں کا ذکر تک سننا گوارا نہیں کرتا-فاضل مصنف نے اس افراط و تفریط سے اپنا دامن بچاے رکھا ھے-وہ موخرالذکر گروہ سے خطاب کرتے ھوے کہتے ھیں اور بہت صحیح کہتے ھیں:—

> "عورتوں پر دور ماضی کا بہت بڑا اثر پڑا ھے اور اس نے عورت کو اپنے مناسب حال اخلاق اختیار کرنے پر آمادہ کیا ھے-اب نسلاً بعد نسل یہ مصنوعی اخلاق اس کے اندر راسخ ھوگئے ھیں "تربیت" اور انتخاب جنسی نے ان کو اور بھی نمایاں کر دیا ھے-تربیت کے ذریعہ سے لڑکی کو ان اوصاف کا خوگر کیا جاتا ھے جو اس کے لئے پسندیدہ خیال کئے جاتے ھیں..............اور انتخاب جنسی کے ذریعہ سے ان اوصاف کو نشو و نما حاصل ھوتی ھے جو مرد کو خوش نما معلوم ھوتے ھیں-چونکہ مرد صرف اس لڑکی سے شادی کرتا ھے جس میں یہ اوصاف پاے جائیں-اس لئے نسلاً بعد نسل یہ خواص موروثی بنتے چلے جاتے ھیں"—

....

> "عورت کے اندر اس قسم کی مخفی قوتیں موجود ھیں جو اس کی حالت کو بہتر بنا سکتی ھیں اس پر

ایک طویل مدت تک مظالم کئے گئے ہیں........
مقتضائے انصاف نہیں ہے کہ اب بھی ہم اس پر
جابرانہ حکومت کریں —

——:o:——

اول الذکر گروہ سے فاضل مصنف کا خطاب یہ ہے:—
"تربیت سے زیادہ خود نسوانیت عورت کی ذات
پر اثر ڈالنے والی چیز ہے......
اور یہی نسوانیت حقیقی اور اساسی موثر ہے"

....

"ایک محدود حد تک عورت کو لازمی طور پر
مرد کی اطاعت کو قبول کرنا پڑے گا اور اگر اس
نے اس اطاعت کو قبول کرنے سے انکار کیا تو نظام
بشری کلیتاً اُلٹ پلٹ جائے گا۔ بلکہ اگر کوئی انسان
اس کی کوشش کرے تو خود عورت کی فطرت۔ اس
کے اعضا کی ساخت۔ اس کا اخلاق اور اس کا مزاج
اس مقصد کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا کرے گا"—

——:o:——

مذکورۂ بالا اقتباسات سے عورتوں کے متعلق فاضل مصنف کا نقطۂ خیال پورے طور پر معلوم ہو جاتا ہے اور اس میں اضافہ یا کمی کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔ اگر ہمارے پر جوش جدید تعلیم یافتہ نوجوان یہ سمجھ لیں کہ باوصف مساوات ذہنیت عورت اپنا ایک مخصوص نظام ترکیبی بھی رکھتی ہے یعنی "نسائیت" تو وہ یورپ اور امریکہ کی کورانہ تقلید چھوڑ دیں۔ دوسری طرف اگر ہمارے ملک کے قدامت پسند حضرات اس حقیقت پر غور کریں کہ عورت کی موجودہ حالت۔ اس کی کمزوریاں۔ اس کی مکتسب عادتیں یہ سب کے سب اس میں ماحول کے اثرات یا بقول فاضل پروفیسر "انتخاب جنسی" (Sexual Selection) کی بدولت پیدا ہوئے ہیں اور انہیں بدلنا ممکن ہے تو وہ عورت کو حقیر خیال کرنا چھوڑ دیں۔ اس کی قابلیت کا صحیح اندازہ کریں اور اسے اس کے مناسب حال رتبہ پر ضرور سرفراز کریں —

——:o:——

کتاب میں عورت کی نفسیاتی خصوصیات مثلاً غیرت۔ کثیر الکلامی۔

جذبہ راست بازی - تنگ خیالی - تلون مزاجی وغیرہ پر بھی مفصل بحث کی گئی ھے - جو بجائے زمانہ حال کی تحقیق کے زیادہ تر متقدمین کے خیالات سے ماخوذ ھے - مثلاً عورت کی ذھانت اور حافظہ کے جو نقائص فاضل مصنف نے بتائے ھیں ان کی تصدیق تازہ ترین نفسیاتی اختیارات سے نہیں ھوتی —

کتاب کا طرز فلسفیانہ ھے - ترجمہ میں بھی یہی اثر پیدا ھوگیا ھے - مناسب ھوتا کہ زیادہ سلجھا ھوا ترجمہ ھوتا - موجودہ ترجمہ بھی بہت بلند پایہ ھے —

نسوانی مسائل پر غور کرنے والے حضرات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضرور مفید ھوگا —

کاغذ معمولی لکھائی چھپائی اچھی ایک روپیہ ۸ آنہ میں صوفی پرنٹنگ کمپنی پنڈی بہاءالدین سے مل سکتی ھے —

(و)
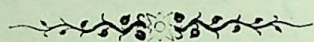
شالامار باغ

یہ سو صفحات کی کتاب مولوی محمدالدین صاحب فوق لاھوری کی تالیف ھے - جس میں موصوف نے نہایت تلاش و جستجو سے ھندوستان کے اُس مشہور آفاق تاریخی باغ کے حالات تاریخی لکھے ھیں جو لاھور میں شالامار کے نام سے معروف - مرحوم شاھجہاں بادشاہ کے شوق تعمیر کی دلفریب یادگار اور آج بھی باوجود اپنی بربادیوں کے نادرۂ روزگار ھے - جناب فوق بہت سی تاریخی کتابوں کے مولف ھیں اور آپ کے تالیفات کو ملک میں پوری مقبولیت حاصل ھو چکی ھے - چنانچہ یہ رسالہ بھی بارھا ارباب ذوق کے ھاتھوں تک پہنچ چکا ھے - مگر اس جدید اشاعت میں مولف صاحب نے بہت کچھہ مزید تاریخی معلومات کا اضافہ کیا ھے اور اب یہ باغ شالامار کی ایک عمدہ اور مکمل تاریخ ھو گیا ھے - مزید دلچسپی کے لئے لایق مولف صاحب نے یہ کیا ھے کہ کشمیر - پنجاب - ھندوستان میں اور جتنے باغ اس نام کے ھیں ان کے حالات بھی بہم پہونچا کر شامل کر دئے ھیں —

چھوٹے سائز پر معمولی چھپی ھے اور آٹھہ آنہ میں ظفر برادرس تاجران کتب لاھور سے ملتی ھے —

(م)
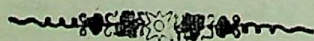
تاریخ و سیرت

ترجمہ تزک بابری اُردو معروفہ بابرنامہ

یہ کتاب بابر بادشاہ کے خود لکھے ہوئے سوانح زندگی کا اُردو ترجمہ ہے جو شاہزادہ مرزا نصیرالدین حیدر گورگانی المتخلص بہ فانی مرحوم و مغفور نے فارسی ترجمہ سے سلیس اُردو زبان میں کیا ہے۔مترجم نے اسے ۱۸ جمادی الاول سنہ ۱۳۱۶ ہجری کو قیام حیدرآباد کے زمانہ میں ختم کیا لیکن طبع ہونے کی نوبت اُن کی وفات کے بعد سنہ ۱۳۴۳ ہجری میں آئی حضرت مترجم انارالله برهانه کی محنت شاقه اور اُن کی صاحبزادی خجستہ سلطانہ بیگم صاحبہ سلمہاالله الرحمن کی توجہ کاملہ کا یہ نتیجہ ہے جو یہ بے نظیر کتاب نہایت شیریں با محاورہ اردو زبان میں زیور طبع سے آراستہ نظر آتی ہے۔اس کتاب کا ترجمہ تقریباً یورپ کے ہر زبان میں ہو گیا ہے اور یہ بڑی صدمہ کی بات تھی اور بڑی کمی تھی کہ اُردو زبان اس دولت سے محروم تھی۔اس لئے صاحبزادی صاحبہ کا جہاں تک شکریہ ادا کیا جائے کم ہے کہ انہوں نے اپنے والد ماجد مرحوم و مغفور کے یادگارھی کو زندہ نہیں کیا بلکہ اُردو داں پبلک پر بڑا احسان کیا۔

جناب شہزادہ مرزا نصیرالدین حیدر مرحوم جیسا کہ مقدمۂ کتاب سے معلوم ہوتا ہے ترکی زبان سے واقف تھے اور ایک ترکستانی عالم سید محمد آفندی سے حاصل کی تھی۔یہ اُردو ترجمہ گو عبدالرحیم خاں خانخانان کے فارسی ترجمہ سے کیا گیا ہے مگر اُس فارسی ترجمہ میں اس قدر ترکی الفاظ ہیں کہ جب تک قدیم ترکی زبان سے واقفیت نہ ہو فارسی سے بھی ترجمہ کرنا دشوار ہے چنانچہ جن لوگوں نے یورپ کی زبانوں میں فارسی سے ترجمہ کیا ہے وہ بھی ایک گونہ ترکی زبان سے واقفیت رکھتے تھے۔اُردو میں ترجمہ ہونے کے بعد اس کا مقابلہ جان لیڈن صاحب کے ترجمہ سے بھی کیا گیا ہے۔جان لیڈن صاحب کے ترجمہ کے متعلق ذیل کے سطور میں کچھ ذکر کیا جاے گا۔خجستہ سلطانہ بیگم صاحبہ اپنی مقدمہ کتاب میں تحریر فرماتی ہیں کہ " ابتداء تو اس کام میں حضرت کے ایک انگریزی خواں دوست نے اپنا وقت عزیز صرف کیا اور جب وہ نبھا

نہ سکے تو میرے برادر مرحوم مرزا قمرالدین حیدر جو اُس وقت زندہ تھے اور راقمہ نے باوجود اپنی کم لیاقتی کے اپنی خدمات نذر کیں پھر برادر مرحوم کو بھی خدمات مفوضہ سرکاری کے سبب سے فرصت نہ ملی لیکن راقمہ نے یہ مبارک خدمت بفضل الہی آخر تک انجام دی" واقعی اس ترجمہ میں صاحبزادی صاحبہ (سلمہااللہ تعالیٰ) نے جو کد و کاوش فرمائی ہے اور حسن اسلوب کے ساتھہ جو انتظام طبع فرمایا ہے وہ ہم سب کے شکریہ کا مستحق ہے۔ جو کام اس وقت تک بڑے بڑے مردوں سے نہ ہو سکا وہ ان لایق بی بی نے انجام دیا۔ کاتب حروف کے پاس سواے تعریف و عقیدت مندی کے ان کے لئے کوئی الفاظ نہیں خداے بزرگ و برتر اُنہیں بہت دنوں سلامت رکھے! اور ایسے بہت سے کام اُن کے ہاتھہ سے کرائے! یہ بی بی مردوں سے گوے سبقت لے گئیں اور قوم کے لئے باعث فخر ہیں —

بابر نامہ کے اس وقت تک آتھہ قسم کے نسخے دنیا کی نظر سے گذرے ہیں جنکی تفصیل مسز بیورج نے اپنے ترجمہ کے مقدمہ میں حسب ذیل دی ہے:—

۱- بابر کا اپنا قلمی نسخہ سنہ ۱۵۳۰ع میں لکھا گیا اس میں کچھہ اوپر ۳۸۲ صفحے تھے سنہ ۱۶۲۸ع سے ۱۶۳۸ع تک شاہی کتب خانہ میں اس کا پتہ چلتا ہے اس کے بعد غائب ہو گیا —

۲- خواجہ کلاں احراری کا نسخہ-یہ سنہ ۱۵۲۹ع میں لکھا گیا تقریباً ۳۶۳ صفحے تھے-جس سال مکمل ہوا اسی سال سمرقند بھیجا گیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کس کا لکھا ہوا ہے-کہا جاتا ہے کہ خواجہ کلاں کے خاندان میں اب تک محفوظ ہے —

۳- ہمایوں کا نسخہ جس پر اس کے حکم سے حاشیہ چڑھایا گیا تھا-غالباً اس کی تکمیل سنہ ۱۵۳۱ع میں ہوئی اس کا لکھنے والا شاید علی الکاتب تھا سنہ ۱۵۵۶ع سنہ سے ۱۵۶۷ع تک شاہی کتب خانہ میں اس کا پتہ چلتا ہے —

۴- محمد حیدر و غلات کا نسخہ-یہ سنہ ۱۵۳۶ع و سنہ ۱۵۴۰ع کے درمیان لکھا گیا ہے ممکن ہے کہ خود محمد حیدر مولف تاریخ رشیدی کے ہاتھہ کا لکھا ہوا ہو-سنہ ۱۵۴۰ع و سنہ ۱۵۴۷ع میں کشمیر میں اس کا پتہ چلا ہے خیال کیا جاتا ہے کہ اب کاشغر میں ہے —

۵- الفنسٹن صاحب کا نسخہ-اس کی تاریخ کتابت مابین سنہ ۱۵۵۶ع و سنہ ۱۵۷۶ع ہے اس میں تقریباً (۲۸۶) صفحے تھے-کتب خانہ ادووکیٹ (Advocates' library) میں سنہ ۱۸۱۶ء سے سنہ ۱۹۲۱ع تک پتہ تھا-سنہ ۱۸۱۰ء

میں بمقام پیشاور یہ خریدا گیا تھا۔

۶۔ برٹش میوزیم کا نسخہ۔ سنہ ۱۶۲۹ ع میں تحریر ہوا ہے۔ اس میں صرف (۹۷) ورق ہیں۔ سب پرزے پرزے ہیں۔ علی الکشمیری اس کا کاتب تھا۔

۷۔ نسخہ لندیسیانا۔ نور محمد خواہر زادہ ابوالفضل نے اسے سنہ ۱۶۲۵ ع میں لکھا تھا۔ اس کے صرف (۷۱) ورق دستیاب ہوے ہیں جو اب جان ریلنڈ (Jhon Ryland) کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔

۸۔ حیدرآبادی نسخہ۔ غالباً سنہ ۱۷۰۰ ع کا قلمی ہے اس میں ۳۸۲ صفحے ہیں۔ مسز۔ اے بیورج Mrs. A. S. Beveridge نے اسے ایڈٹ کیا اور سنہ ۱۹۰۵ ع میں مسٹر گب ٹرسٹ (Gibb Trust) نے فوٹو لے کر شایع کیا۔ یہ نسخہ سب سے زیادہ صحیح ہے۔ مسز بیورج کی نظر سے بمقام حیدرآباد دکن سنہ ۱۹۰۰ ع میں گزرا تھا اور سید علی بلگرامی مرحوم کی کوششوں سے مسز بیورج کو دستیاب ہوا جنہوں نے (۱۸) سال کی محنت میں اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور مفصل حاشیے چڑھا کر شایع کیا۔

فارسی میں بابر نامہ کا پہلا ترجمہ سنہ ۱۵۸۳ ع میں پائندہ حسین مغول غزنوی اور محمد قلی مغول حصاری نے کیا تھا۔ دوسرا فارسی ترجمہ سنہ ۱۵۸۹ ع میں شہنشاہ اکبر کے حکم سے محمد عبدالرحیم خاں خانخاناں ترکمان نے کیا۔ ان دونوں نے اپنے ترجموں کا نام واقعات بابری رکھا۔ مسٹر لیڈن اور مسٹر ارسکن نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا مگر فارسی ترجمہ سے کیا۔ اصل ترکی سے نہیں کیا اصل ترکی سے بابر نامہ کا ترجمہ صرف مسز اینٹ۔ ایس بیورج Mrs. Annette S. Beveridge نے کیا ہے جو اس زمانہ میں سب سے زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے۔ ان تینوں ترجموں میں باہم بہت اختلاف ہے جن پر تفصیلی بحث کرنا یہاں مقصود نہیں صرف معمولی سا ذکر کیا جاے گا۔ یہ اُردو ترجمہ بابر نامہ جو اس وقت زیر تنقید ہے عبدالرحیم خاں خانخاناں کے فارسی ترجمہ کا ترجمہ ہے اور لیڈن صاحب کے ترجمہ سے مقابلہ کرکے درست کیا گیا ہے۔ یہ نہ معلوم ہوسکا کہ یہ فارسی ترجمہ شہزادہ مرزا نصیرالدین حیدر مرحوم کے پاس کہاں سے آیا۔ کاتب حروف کے پاس جو نسخہ ہے وہ مرزا محمد شیرازی ملک الکتاب بمبئی کا طبع کردہ ہے جس کے آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ " کتاب مذکور از کتب خانۂ عالی جاہ راجہ مہاھوپادیایا سانول داس جی ممبر کونسل راج اودےپور مرا بدست آمد لہذا بہ ترسیم آں رغبت گماشت

و حتی الامکان به تصحیح آں کوشید۔ اماچوں تصحیح ایں قبیل کتاب که منحصر به نسخه واحد و اکثر الفاظ ترکی دارد چنانچه باید بفعل نمی آید "۔یه صحیح ھے واقعی اس نسخے میں بکثرت غلطیاں موجود ھیں۔میرزا نصیرالدین حیدر مرحوم کے اُردو ترجمه کا اس فارسی ترجمه سے سرسری مقابله کرنے پر معلوم ھوا که یه اُردو ترجمه لفظی ترجمه نہیں ھے بلکه رواں ھے مثلاً—

صفحه ۱ سطر ۱۴ میں ھے "ازبکوں کے حملے سے اس زمانه میں ایسی ویرانی ھے" (اُردو ترجمه)۔فارسی ترجمه یه ھے "از جهت عبور اوزبک درایں تاریخ ویران شده "۔ترکی الفاظ یه ھیں " مغل و ازبک جهت دین " یعنے مغلوں اور اوزبکوں کی وجه سے۔مسز بیورج لکھتی ھیں که الفاظ "از جهت عبور اوزبک " خانخاناں کے بڑھاے ھوے ھیں جن سے صرف صراحت مقصود تھی اس لئے که الماليغ و الماتو اور یانگی یه تینوں شہر مشرق و مغرب کے راسته پر جہاں سے خانه بدوش اقوام آیا کرتی تھیں واقع تھے۔ترجمه میں اس کی طرف اشاره کرنا مقصود تھا جو "عبور" کا لفظ بڑھایا گیا۔ارسکن اور لیڈن نے اس کا ترجمه "از جهت حمله ھاے اوزبک" کیا ھے جو نه ترکی کا صحیح ترجمه ھے اور نه اس میں وه رعایت ھے جو وضاحت کے خیال سے خانخاناں نے رکھی تھی۔اسی انگریزی ترجمه لیڈن صاحب کا ترجمه شہزاده صاحب کا اُردو ترجمه ھے—

صفحه ۵ سطر ۱ "اس کو تاریخ کی کتابوں میں اخشیکت کے نام سے لکھا ھے" فارسی ترجمه میں ھے "در کتب اخشیکت می نویسند" اصل ترکی میں ھے " کتابوں میں اسے اخشیکیت لکھتے ھیں "

صفحه ۵ سطر ۴-۶ " دریاے سیحون قلعه کے فصیل کے نیچے ھی بہتا ھے۔اس کا قلعه ایک اونچے کھڈ پر بنا ھوا ھے جو دریا کے کرارے پر ھے۔کھڈ کی گہرائی گویا قلعه کی خندق ھے۔عمرشیخ مرزا نے جب اس کو دارالسلطنت بنایا تو دو ایک مرتبے باھر کی جانب اور پشتے تعمیر کئے" یه ترجمه اِس فارسی کا ھے "دریاے سیحون از پایه قلعه او میریزد۔وقلعه او برجر بلندی واقع شده۔بجاے خندق جرھاے عمیق افتاده عمرشیخ مرزا که آں را پاے تخت ساخت یکدو مرتبه از بیرون ھم باز جرھا انداخت" مسز بیورج نے جو ترجمه کیاھے اس کی اردو یه ھے۔"فصیل سے گھرے ھوے شہر کے نیچے دریاے سحیوں بہتا ھے۔یه قرغان (یعنی محصوره بستی اور قلعه سب) ایک بڑے کھڈ (دره) پر واقع ھے اور خندق کے جگه اس میں گھرے گھرے درے ھیں۔عمرشیخ مرزانے جب اسے اپنا پاے

تخت بنایا تو دو ایک مرتبہ بیرونی درون میں سے (چند) اور درے کاٹے "
اسپر مسز بیورج نے ایک بڑا نوٹ دیا ھے جو بہت دلچسپ ھے مگر طوالت کے
خیال سے یہاں نہیں درج کیا جاتا۔ انکا مقصود یہ ھے کہ عمر شیخ مرزا نے پانی کے لئے
نہریں کاٹ کر نکالی تھیں جنہیں اسی شہر اخشی کے مشرق و مغرب میں باھم
لاکر ملا دیا تھا تاکہ شہر کی حفاظت کا کام بھی اُن سے لیا جاسکے اور شہر میں
زیادہ پانی بھی پہونچایا جاسکے۔ بابر دو لفظ الگ الگ استعمال کرتا ھے قرغان
اور ارک۔ قرغان سے مراد ھے وہ شہر جس کے گرد فصیل ھو معہ اندرونی قلعہ کے
جسے ارک کہتے ھیں۔ خانخاناں نے اور انکے اتباع میں مرزا نصیر الدین حیدر
مرحوم نے قرغان اور ارک دونوں کا ترجمہ قلعہ ھی کیا ھے اور جو فرق انکے
معنوں میں ھے اسے نظر میں نہیں رکھا۔

صفحہ ۵ سطر ۱۲ " بارہ سنگھا " ترجمہ کیا گیا ھے بوغو مرال کا جس کے اصلی
معنی گوزن کے ھیں۔ حیدرآبادی ترکی نسخہ میں اس لفظ کے نیچے معنی کے
طور پر گوزن کا لفظ لکھا ھوا ھے اور واقعات بابری میں بھی اس کا ترجمہ گوزن
کیا گیا ھے۔ لیکن خانخاناں کا جو فارسی ترجمہ ھمارے سامنے ھے اس میں صرف
بوغو مرال ھی لکھا ھوا ھے۔

صفحہ ۸ سطر ۴ و ۵ " معجون بہت کھانے لگے تھے۔ معجون کھانے کے بعد
مزاج چڑچڑا ھو جاتا تھا۔ رحمدل بہت تھے۔ بغل اور داغ بہت رکھتے تھے " یہ
ترجمہ بالکل غلط کیا گیا ھے۔ مترجم نے نوٹ میں بعض الفاظ کے نہ سمجھنے کا
اعتراف کیا ھے۔ فارسی ترجمہ کی اصل عبارت یہ ھے " در آخر معجون بسیار
اختیار میکرد و در معجون گری کلہ خشک می شد۔ متیم شعار بود و نعل داغ
بسیار داشت " مسز بیورج کے ترجمہ کی اُردو یہ ھے " آخر زمانہ میں معجون کو
ترجیح دیتے تھے اور اس کے ترنگ میں بیخود رھا کرتے تھے۔ عاشق مزاج تھے
اور محبت کے داغ (دل پر) بہت رکھتے تھے " اس معنی کے سند میں مسز بیورج
نے نظامی کا یہ مصرعہ پیش کیا ھے۔

ھنوز از عشق بازی گرم داغ ھست

صفحہ ۱۲ سطر ۱۱ " جنگ یاسی کجیت میں گھمسان کی لڑائی لڑا تھا بھاگڑ
اور مصیبت کے موقعہ پر جب میں نے کوھستان مسیخا سے سلطان محمود خان
پاس جانے کا ارادہ کیا " فارسی ترجمہ ھے " و از جنگ یاسی کجیت ھم خوب
چاپقولاش کردہ بود۔ در قزاقیہا وقتے کہ در کوھستان مسیخا عزیمت رفتن پیش
سلطان محمود خان کردم " چاپقولاش سے مراد باھم شمشیر زنی کرنا ھے۔ قزاقی

کا لفظ اُن لڑائیوں کے لئے آیا ہے جو تخت چھن جانے کے بعد کھینگاھوں میں بیٹھ کر بابر نے لڑی تھیں-انہیں انگریزی میں "گوریلا وارفیر" کہتے ہیں-اُردو ترجمہ سے یہ مفہوم ظاہر نہیں ہوتا جہاں اس لفظ کا ترجمہ ہمیشہ "مصیبت کے موقعے" کیا گیا ہے—

صفحہ ۱۱ سطر ۲۰-فارسی کا ایک شعر ہے جس کا آخری لفظ ارزین ہے-فارسی نسخہ میں بھی یہی ہے جسے کتابت کی غلطی کہنا چاہئے مگر مسز بیورج ارزین لکھتی ہیں جو صحیح ہے-دیباچہ انوار سہیلی میں یہ شعر موجود ہے—

صفحہ ۱۴ سطر ۱۲-۱۳ "سنہ ۹۰۸ ہجری میں جب میں نے خسرو شاہ کے آدمیوں کو توڑ لیا اور کابل میں مقیم کو جا گھیرا" فارسی ترجمہ ہے "در تاریخ نہصد و دہ کہ خسرو شاہ را ہمراہ گرفتہ در کابل مقیم را قبل کردہ بودم" سنہ کی غلطی ہے فارسی ترجمہ میں سنہ صحیح ہے نام مقیم نہیں ہے بلکہ مقیم ہے "خسرو شاہ را ہمراہ گرفتہ" اس فارسی اور اس کے اُردو ترجمہ "خسرو شاہ کے آدمیوں کو توڑ لیا" ان دونوں میں بڑا فرق ہے-حیدرآبادی ترکی نسخہ فارسی ترجمہ کی تائید کرتا ہے اس کا اُردو ترجمہ یہ ہے "سنہ نوسو دس ہجری میں جب کہ خسرو شاہ کے ہمراہ میں نے کابل میں مقیم کو محصور کیا"—

صفحہ ۱۵ سطر ۵ و ۶ "اس کا دعویٰ تھا کہ میں جادوگر ہوں" فارسی ترجمہ ہے "دعوی یدہ چی گری میکرد" یدہ چی گری کے معنے جادوگری کے نہیں ہیں-مسز بیورج نے اس کا ترجمہ Jade-stone سے پانی برسانا کیا ہے-اُردو ترجمہ سے یدہ چی گری کی یہ خصوصیت نہیں ظاہر ہوتی اور جادو کا عام مفہوم سمجھ میں آتا ہے جو صحیح نہیں ہے—

صفحہ ۱۶ اُردو ترجمہ میں "سنہ ۸۹۹ ہجری کے واقعات" یہ الفاظ بطور عنوان درج ہیں-فارسی ترجمہ میں ہے "وقائع سال اول جلوس مطابق سنہ ۸۹۹ ہجری"-مسز بیورج نے کوئی ایسا عنوان نہیں قایم کیا-ترکی نسخہ میں صرف تسلسل واقعات ہے سال جلوس اول کی صراحت کر کے واقعات درج نہیں کئے ہیں مگر اس میں کوئی ہرج نہیں-فارسی ترجمہ اور اُردو ترجمہ کے یہ اختلافات کتاب زیر ریویو کے صرف سولہویں صفحہ تک سرسری طور پر نظر آے ہیں-اگر بغور دیکھا جاے تو ہر جزو میں کم و بیش اسی قدر ملیں گے-مثال کے طور پر بس انہیں کافی سمجھا جاے-عیسوی تاریخیں آسانی کے لحاظ سے ہجری سنین کے مطابق اکثر صحیح لکھی گئی ہیں مگر بعض بعض جگہ غالباً سہواً

غلطی ہو گئی ہے مثلاً صفحہ ۴۷ کے چوتھے نوٹ میں بجائے سنہ ۱۴۹۷ع کے سنہ ۱۴۵۷ع درج ہو گیا ہے۔ یہ یقیناً کاتب کی غلطی ہے مگر ایسی غلطیاں نہ ہونی چاہئیں۔ اصل ترکی نسخہ میں دستبرد زمانہ سے سنہ ۹۱۴ھ کے واقعات کا صرف ایک ورق باقی رہ گیا ہے۔ اس کے بعد سے سنہ ۹۲۵ ہجری تک کے اوراق ضائع ہو گئے اور کتاب میں نہیں ہیں۔ سنہ ۹۲۵ ہجری سے واقعات کا سلسلہ پھر شروع ہوتا ہے لیکن سنہ ۹۲۶ ہجری کے چند ورق کے بعد بہت سے اور ورق غائب ہیں اور سنہ ۹۳۲ ہجری سے پھر سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ تمام واقعات اُردو ترجمہ میں (باتباع مطبوعہ ترجمہ فارسی) سنہ ۹۱۵ ہجری اور سنہ ۹۲۷ ہجری کے نیچے درج کئے گئے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ اسے تحقیق کر کے لکھنا چاہئے تھا۔

مقامات کے نام نیز اشخاص کے نام کہیں کہیں غلط اور بلا تحقیق و تصیح لکھ دئے گئے ہیں۔ یہ چیز نہایت اہم اور سخت محنت و جانفشانی کی محتاج ہے۔ صرف دو ایک مقام کی مثال یہاں دی جاتی ہے ورنہ پوری کتاب سے انتخاب کرنا ایک غلط نامہ تیار کرنے کے برابر ہے۔

صفحہ ۱ اُطرار غلط ہے۔ اس کے جگہ طراز ہونا چاہئے۔ اُطرار مغربی ترکستان میں ہے اور طراز مشرقی ترکستان میں۔ متن میں مشرقی ترکستان کا ذکر ہے اس لئے اس میں اُطرار صحیح نہیں ہو سکتا۔

ایغاچ ایک لفظ ہے جو بارہا اس کتاب میں آیا ہے۔ اس کا ترجمہ فارسی میں فرسنگ کیا گیا ہے مگر یہ غلط ہے۔ ایغاچ ایک۔ مقررہ فاصلہ کے لئے نہیں آتا اور کم و بیش ہوتا رہتا ہے کہیں فرسنگ کا مرادف ہوتا ہے اور کہیں نہیں۔ اسلئے فرسنگ کی جگہ اس لفظ کو ہمیشہ داخل کرنا بے احتیاطی بلکہ غلطی ہے۔ صفحہ ۲۰ پر سلطان احمد مرزا کی ایک بیوی کا نام قبلق بیگم لکھا ہے جو غلط ہے۔ صحیح لفظ قتاق یا قاتاق ہے۔ حاشیہ میں مترجم نے اشارہ کر دیا ہے مگر متن میں صحت نہیں کی۔ صفحہ ۶۶ سطر ۲۱ میں توقد بیگ غلط نام ہے۔ صحیح نام توقا بیگ ہے۔ اسی طرح محمد دوست اور علی دوست دو الگ الگ شخصوں کا مذکور نہیں ہے بلکہ صرف محمد دوست کا ذکر ہے جو علی دوست کا لڑکا ہے۔ صفحہ ۴۴ سطر ۱۸ و ۱۹ میں پل محمد حبیب غلط نام ہے۔ صحیح نام ہے پل محمد چپ۔ غرض کہ اسی طرح کے ناموں میں بکثرت غلطیاں ہیں جو نظر ثانی کی سخت محتاج ہیں۔

بابر نے بعض مقامات پر مثلاً خواجہ مولانائے قاضی ابراہیم سارد۔ گوک سدائے وغیرہ کے حالات بطور جملہ معترضہ سلسلۂ واقعات سے الگ کر کے لکھے ہیں۔ فارسی ترجمہ کی کتابت میں ایک سلسلہ میں انہیں درج کر دیا گیا ہے

اور اُردو ترجمه میں بھی یہی کیا گیا ہے۔مناسب ہوتا که انہیں اس طرح لکھا جاتا که سلسله یہاں منقطع نه معلوم ہوتا اور یه بھی اپنی جگه رہتے۔ترکی اصل کتاب سے اگر مقابله کیا جاے تو بعض مقامات پر بہت تقدم و تاخر معلوم ہوگا مثلاً اُردو ترجمه میں (باتباع فارسی مطبوعه ترجمه) صفحه ۴۴ پر سنه ۹۰۳ کے واقعات میں سلطان حسین مرزا اور بدیع‌الزماں مرزا کی لڑائی۔ بدیع‌الزماں کے ذوالنون کے پاس جانے تک کا حال درج ہے جو حیدرآبادی ترکی نسخه میں موخر رکھا گیا ہے اور سنه ۹۰۲ ہجری کے واقعات میں درج کیا گیا ہے۔اس طرح اور دو ایک مقام پر یہی حال ہے اور الفاظ میں تو اکثر اختلاف ہے جس کی صراحت طوالت سے خالی نہیں۔اگر یه امر تحقیق کر لیا جاتا که کس سنه کے یه واقعات ہیں اور اُسی سنه کے تحت میں درج کئے جاتے تو مناسب ہوتا۔

اس اُردو ترجمه کا جان لیڈن صاحب کے ترجمه سے مقابله بھی ہوا ہے۔ لیڈن صاحب کا ترجمه خود بالکل ناقص اور تصحیح طلب ہے۔مسٹر ارسکن کو جب یه ترجمه ملا تو انہیں بہت خوشی ہوئی۔وہ لیڈن صاحب کو بڑی منزلت دیتے ہیں مگر یه کہے بغیر نہیں رہ سکتے که "اس ترجمه کے ملنے نے مجھے عجیب گومگو کی حالت میں ڈال دیا۔دونوں ترجمے (یعنی خود ان کا اور لیڈن صاحب کا) بہت سے اہم جزئیات میں اختلاف رکھتے ہیں لیکن چوں که ڈاکٹر لیڈن کو اصل نسخه سے ترجمه کرنے کا موقعه ملا تھا میں نے خیال کیا که جہاں تک ہوسکے انہیں کے ترجمه کو اختیار کروں اور صرف ایسے مقامات تبدیل کرتا جاوں جو متن سے یا تزک کے دیگر حصص سے صاف طریقه پر غیر مطابق نظر آئیں یا جو بالکل سہو نظری سے تحریف ہوگئے ہوں جو ایک نامکمل کام میں لازمی طور پر واقع ہوا کرتی ہیں"۔ ارسکن کے مقدمه میں بہت سے ایسے صاف صاف اشارے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے که وہ ڈاکٹر لیڈن کے ترجمه کو سمجھتے ہیں که محض مشق کے طور پر کیا گیا تھا اور اس میں بہت کچھه تصحیح و ترمیم کی ضرورت باقی تھی۔کاش اس اُردو ترجمه کا مقابله بجاے لیڈن صاحب کے مسز بیورج کے ترجمه سے کیا جاتا اور جو نوٹ که لیڈی صاحبه نے لکھے ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جاتا۔مجھے یقین ہے که اگر خجسته سلطانه بیگم صاحبه کو اس کا علم ہوتا تو وہ ضرور ایسا کرتیں۔

مسز بیورج نے اپنا ترجمه چار حصه کرکے جون سنه ۱۹۱۲ ع مئی سنه ۱۹۱۴ ع اکتوبر سنه ۱۹۱۷ ع اور ستمبر سنه ۱۲۹۱ ع میں ٹکڑے ٹکڑے کرکے شایع کیا

ہے۔ انہیں مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کی مدد سے ایک ترکی قلمی نسخہ مل کیا تھا۔ جو ان کی تحقیقات میں بابر کے اپنے قلمی نسخہ سے نقل کیا گیا ہے۔ بابر کے اس نسخہ کو عبدالحمید (مولف پادشاہ نامہ) نے سنہ ۱۶۲۸ ع و سنہ ۱۶۳۸ ع کے مابین شاہ جہاں کے ذاتی کتب خانہ میں دیکھا ہے۔ یہ اب نادر شاہ کے دستبرد اور سنہ ۱۸۵۷ ع کی بغاوت کی بربادی سے خدا معلوم کہاں ضائع ہو گیا ہے۔ حیدرآبادی ترکی نسخہ جو اس کی نقل ہے اورنگ زیب کے زمانہ (سنہ ۱۶۵۵ ع۔ سنہ ۱۷۰۷ ع) کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مسز بیورج نے پروفیسر براؤن کو یہ نسخہ دکھایا تھا اور ان کے مشورے کے بعد چھاپا گیا۔ مگر اس میں بھی بہت سے ورق غائب ہیں۔ اور تسلسل بیان میں وقفہ پڑ پڑ جاتا ہے۔۔

محمد حیدر مرزا دغلات کے پاس بھی ایک اصلی نسخہ تھا جس سے وہ تاریخ رشیدی میں بکثرت انتخابات درج کرتا جاتا ہے۔ ان ایام کے حالات معلوم کرنے میں جن کے ورق گم ہو گئے ہیں اس نسخہ سے بہت مدد مل سکتی ہے۔ اصل ترکی بابر کی اپنی زبان ہے۔ مسز بیورج نے باوجود ارسکن اور لیڈن کے ترجموں کے حیدرآبادی ترکی نسخہ سے ترجمہ کرنے کا ارادہ صرف اس لئے کیا کہ وہ لیڈن کے نسخہ کی طرح نامکمل اور خراب نہ تھا اور ارسکن کے ترجمہ کے مقابلہ میں جو فارسی ترجمہ کی مدد سے کیا گیا ہے اصل ترکی سے ترجمہ کرنا اصلیت کو زیادہ قائم رکھنا تھا۔ بابر کے اپنے رنگ اور خصوصیات کا جو اندازہ خود اس کے الفاظ سے ہو سکتا ہے وہ اس کے کلمات کے اون ترجموں سے نہیں ہو سکتا جو فارسی میں ترجمہ کئے گئے تھے۔ ارسکن کے ترجمہ میں یہ بات مفقود ہے اور لیڈن کے ترجمہ میں جو بالکل نامکمل اور ناقص ہے بدرجۂ اولیٰ مفقود ہے۔ پھر اُس ترجمہ میں یہ کیسے نظر آسکتی ہے جو بامحاورہ رواں اُردو زبان میں فارسی ترجمہ سے کیا جاے اور ایک ناقص ترجمہ سے مقابلہ کر کے صحیح کیا جاے۔ یہ ضروری بات ہے کہ بابر بابر نظر آے نہ کہ اکبر شاہ ثانی یا بہادر شاہ۔۔

اس اُردو ترجمہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی زبان نہایت شستہ اور طرز ادا دلچسپ اور مسلسل ہے کہیں اُلجھن نہیں ہوتی اور گو خانخاناں کے ترجمہ کی طرح اصل ترکی زبان کے انداز و ترکیب عبارت کے مطابق نہیں ہے مگر اس میں شک نہیں کہ ایک بہت مشکل چیز کو حتی المقدور واضح اور سلیس زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ مترجم علیہ الرحمہ کو اس میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔۔

مسز بیورج اپنے ترجمہ کے مقدمہ میں لکھتی ہیں کہ خود ان کے ترجمہ

ارسکن کے ترجمہ اور دی کورتیل کے الفاظ و انداز میں بابر کی شخصیت تین مختلف طرح کی معلوم ہوتی ہے۔اس اختلاف کی وجہ ایک حد تک یہ ہے کہ ہر ایک نے مختلف نسخوں سے ترجمہ کیا ہے لیکن بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ نژاد اہل قلم نے اپنی بے تکلف رواں انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کا خوب استعمال کیا ہے۔ان کی تصویر بلا شک زیادہ صحیح ہوتی اگر ان میں سے ہر ایک اپنے مادری زبان کے استعمال کو صرف ان اجزا تک محدود رکھتا جو ترکیب السنہ کے لحاظ سے پرانی ترکی کے لگ بھگ ہوتی ۔

یہی حال اردو ترجمہ کا ہے جو بابر ترکی زبان میں نظر آتا ہے۔وہ اردو زبان میں نہیں ہے۔وہ "ہم" کا لفظ اکثر صرف اسوقت استعمال کرتا ہے جبکہ خود اس کی ذات کے ساتھہ اس کے اُمراے دولت وملازمین سے بھی مراد لینا مقصود ہو ورنہ شرماتا ہے۔کہیں افعال مجہول استعمال کرکے اپنا صریحی ذکر بچا جاتا ہے اور کہیں جمع متکلم استعمال کرکے دوسرے لوگوں کی آڑ میں خود حجاب کے مارے پوشیدہ رہتا ہے۔اس کے بچپن کی اُمنگ۔شوخ و شنگ طبیعت۔پھر درازی عمر کے ساتھہ پختگی کا آنا اور باوجود بے تکلفی کے متانت یہ سب باتیں اس کی اپنی زبان کے مختلف موقعوں کی عبارتوں ہی سے ظاہر ہوسکتی ہیں۔بے تکلف اردو محاوروں کا آزادانہ استعمال اسے کہیں سے کہیں پہونچا دیتا ہے اور بعض دفعہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ کیا یہ وہی شخص ہے جو اصل ترکی کتاب میں ہے۔میرے خیال میں اس کی ضرورت ہے کہ ترجمہ بہت کچھہ لفظی کیا جاے اور حتی المقدور ترکی زبان کے خصوصیات یا کم سے کم جوقیود کہ بعض ترجموں میں ان خصوصیات کو محفوظ رکھنے کیلئے رکھے گئے ہیں انکی پابندی ملحوظ رہے خواہ زبان کسی قدر اوپری ہی کیوں نہ معلوم ہو۔اس سے آدمی کی صحیح طبیعت کا کسی قدر اندازہ ہوسکے گا لیکن اگر دوسری زبان کے محاورات کو بلا تکلف برتا جاے گا تو اس بات کا اندازہ ہونا مشکل ہے۔بابرنامہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف کی تصویر کی ٹھیک جھلک نظر آے اور معلوم ہو کہ جو شخص بات چیت کررہا ہے وہ کون ہے اور کیسا ہے۔اگر یہ بات ترجمہ میں نہ رہی تو یہ کہا جاے گا کہ اس نے تصویر کے خط وخال کو بدل دیا ہے اور بابر کی ترکی اور ہندی تصویر میں بڑا فرق پڑجاے گا۔عبدالرحیم خان نے فارسی زبان میں اس خصوصیت کو بہت حد تک باقی رکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اکثر ترکی الفاظ استعمال کرتا ہے کہ کچھہ تو صحیح تصویر کا رنگ و روغن باقی رہے۔مثلاً صفحہ ۶۴ سطر ۲۲ و ۲۳ اردو ترجمہ کی یہ عبارت ہے "جونہی

میں نے یہ سنا کہ اندجان والے میرے طرفدار ہیں وونہی میں نے کچھہ تامل نہ کیا۔ سورج نکلتے ہی میں مرغنیان سے چل نکلا اور دن ڈھلے اندجان میں آگیا" اس ترجمہ کی اصل فارسی عبارت یہ ہے "خبر مضبوط ساختن اندجان بمن آمد ہیچ توقف نہ کردہ در وقت آفتاب برآمد از مرغنیان سوار شدہ روز برگشتہ بود کہ باندجان آمدم" مسز بیوج کے انگریزی ترجمہ کی اردو یہ ہے "جونہی میں نے یہ سنا کہ اندجان کو ان لوگوں کی مدافعت میں مضبوط کر لیا گیا ہے سورج نکلتے ہی میں مرغنیان سے گھوڑے پر سوار ہوا اور دوپہر کے قریب اندجان جا پہونچا۔

ایک اور مثال لیجئے۔ اردو ترجمہ کے صفحہ ۶۵ سطر ۱۲ و ۱۳ پڑھے "یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے ہمارے اور خواجہ قاضی کے متعلقین کو لوٹا اور تباہ کیا تھا" خانخاناں کی فارسی یہ ہے "درین فترات ہا نالان و تاراج کنندہ مردمے کہ باما تعلق داشتند و متعلقان خواجہ قاضی ہمیں ہا بودند" مسز بیورج کے انگریزی ترجمہ کی اردو یہ ہے "یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے زمانہ ہائے فترت میں خود میرے اور خواجہ کے متعدد مسلمان متعلقین کو لوٹا اور قید کیا تھا" فترت کے زمانہ سے وہ زمانہ مراد ہے جس میں بابر بے تاج و تخت تھا اور مسلمان کا لفظ جرم کی اہمیت ظاہر کرنے کو لکھتا ہے۔

ان ترجموں کا باہمی فرق ظاہر ہے۔ میرے خیال میں مترجم کا یہ بڑا فرض ہے کہ تصویر کے اصل خط و خال جسقدر ہوسکے باقی رکھنے کی کوشش کرے گو یہ بہت مشکل ہے مگر کچھہ نہ کچھہ کامیابی ضرور ہوسکتی ہے۔

بابر نامہ کے جس قدر نسخے دستیاب ہوے ہیں سب افسوس ہے کہ نا مکمل ہیں یعنے بیچ بیچ میں سے اوراق غائب ہیں جن سے سلسلۂ بیان میں بار بار وقفے پڑ پڑ گئے ہیں۔ اُردو ترجمہ میں اس کی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ واقعات کی لڑی کو جو ٹوٹ ٹوٹ گئی ہے جوڑ دیا جاے۔ فارسی ترجموں میں بھی یہ کمی موجود ہے۔ جب تک ہم عصر مورخین کی تصنیفات کو اُلٹ پلٹ نہ کیا جاے واقعات کا علم ہونا اور چھوٹتے ہوئے مقامات پر ربط قائم کرنا بہت مشکل امر ہے اصل کتاب کے ورقوں کے ضائع ہونے کے بہت سے وجوہ بیان کئے جاتے ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سنہ ۱۵۱۲ع میں حصار کے قریب شاہی کیمپ برباد ہوگیا اُس میں بھی کچھہ ورق ضائع ہوے کچھہ سنہ ۱۵۲۹ع میں ضائع ہوے۔ اس موقعہ پر کتابوں کو نقصان پہونچنے کا ذکر خود بابر کرتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ہمایوں کو سنہ ۱۵۴۱ع سے سنہ ۱۵۵۰ع تک جلا وطن رہنا پڑا۔ اس زمانہ میں

اس کے کتب خانہ پر کیا کیا آفتیں گذری ہوں گی - لیکن یہ معلوم ہے کہ بابر نے اپنے بعد مکمل کتاب چھوڑی اور با وجود نقصانات کے پھر بھی اس کی تکمیل کر دی تھی - یہ پوری کتاب اس کے بعد تک موجود تھی مگر ہمایوں کی جلا وطنی نے ہر چیز کو تہ و بالا کر دیا اور یہی وہ زمانہ ہے جب کہ اس کتاب کو بہت نقصان پہونچا - عبدالرحیم خان خانخاناں کو بھی مکمل کتاب نہیں ملی اس لئے ان کے ترجمہ میں بھی ضائع شدہ اوراق کی جگہ خالی رہ گئی ہے - انہوں نے تکمیل کی کوشش اس لئے نہیں کی کہ اُن کا جو مقصود تھا یعنی آئین اکبری کے لئے ابوالفضل کو مواد بہم پہونچانا وہ پورا ہو گیا تھا ـــ

مسز بیورج نے اس طرف خاص توجہ کر کے تمام واقعات کا سلسلہ ملا دیا ہے کیا اچھا ہوتا اگر مرزا نصیرالدین حیدر صاحب مرحوم یا ان کی صاحبزادی صاحبہ بھی اس کمی کو پورا کر دیتیں - میرے خیال میں اس کمی کے پورا کرنے کی بہت ضرورت ہے تاکہ تاریخ کی یہ کتاب مکمل ہو جائے - نیز اس کی ضرورت ہے کہ مقامات کے نام اور لوگوں کے نام کی صحت کافی طور پر کی جائے اور اُن کے تھوڑے تھوڑے حالات بھی لکھ دئے جائیں - تاہم جو کچھ ہو گیا ہے وہی بہت غنیمت ہے اور ہمارے توقع سے بہت زیادہ ہے ـــ

(عبدالمد)

تاریخ بنی ہاشم

تاریخ اسلام میں بنو امیہ اور بنو ہاشم کی باہمی نزاعت ایک طویل کشمکش ہے جو مملکت اسلام کے لئے سخت مضرت رساں ثابت ہوئی - اس قبائلی مخاصمت و جد و جہد کے متعلق مختلف العقائد فرقوں کی مختلف رائیں ہیں اور اس کے متعلق بہت سی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں چنانچہ یہ کتاب بھی ان میں سے ایک ہے - دوسری تاریخوں کے مقابلے میں ایک چیز جو اس میں بہتر پائی جاتی ہے وہ مولف کی ذاتی رائے ہے - فاضل مولف نے جس واقعہ کو لیا ہے بہ حد امکان اس پر استدلال کیا ہے اور جو کچھ کہا ہے صاف صاف کہا ہے لیکن کتاب پر ایک گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فی الحقیقت حضرت علی کی سوانح عمری ہے ـــ

تاریخ بنو ہاشم میں سب سے زیادہ اہمیت آنحضرت صلعم کو حاصل ہے جنہوں نے دنیا میں ایک زبردست انقلاب پیدا کیا - پیغمبر اسلام کی تعلیم - کامیابی

اور دیگر سوانح کو صرف اکتالیس صفحوں پر بیان کیا ہے اور حضرت علی کا بیان ایک سو پینتالیس صفحوں پر مشتمل ہے—

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مولف کے لئے ایک رائے کا رکھنا ضروری ہے لیکن اس رائے کے اظہار میں غم و غصہ مولف کے شایان شان نہیں۔ اُس کتاب کی تاریخی حیثیت قائم نہیں رہتی جس کے واقعات کا اظہار نہایت درشت پیرائے میں کیا جائے۔ ہم بہ خیال اختصار صرف چند اقتباسات درج کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو—

صفحہ ۲۴ " ابولہب کی زوجہ ایک بد عقل و کمینہ عورت تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ اس بیوی اور اسی سالے کی وجہ سے ابولہب فی النار ہوا "—

صفحہ ۴۵ " ابودجانہ نے چاہا ہے کہ اس ڈائن گائن کا سر اڑا دیں "—

صفحہ ۱۸۰ " دیدہ حاسد کور باد اس پر کمینہ خو جہلائے قریش "

صفحہ ۱۹۴ " افسوس کہ یہ روش مذموم علامہ ممدوح (مولوی شبلی نعمانی) سے مختص نہیں ہے بلکہ ہم ایک گروہ کو اسی خبط مین مبتلا دیکھتے ہیں "—

ذرا مقابلہ کیجئے—

صفحہ ۱۳۶ " عدی نے اس لاش (طرفہ) کو گاڑا "—

صفحہ ۱۳۶ " اس جنگ میں اصحاب امیرالمومنین کی طرف سے صرف سات مجاہد شہید ہوئے "—

اس کے علاوہ مختلف مقامات پر بدکار۔ فاہنجار۔ ظالم۔ سفاک۔ بد خصلت اور دوسرے ایسے بہت سے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جس سے مولف کا رجحان ظاہر ہوتا ہے—

مولف نے جو واقعات درج کئے ہیں ان میں کہیں کہیں تضاد بھی پایا جاتا ہے—

صفحہ ۹۵ " اور فرمایا کہ کل ہم یہاں سے روانہ ہونگے۔ ہمارے ساتھ کوئی وہ شخص نہ چلے جس نے عہد عثمان میں اہل شورش کی حمایت کی ہو "—

صفحہ ۱۴۰ حضرت علی محمد ابن ابوبکر کے متعلق فرماتے ہیں " بخدا میرے علم میں محمد ان لوگوں میں سے تھا جو قضائے الہی کے منتظر رہتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں حصول اجر کے لئے کرتے ہیں اور مومن

سے مانوس اور فاجر سے بیزار رہتے ہیں "۔

سب سے قابل اعتراض وہ دعویٰ ہے جو فاضل مولف نے قریہ فدک کے متعلق کیا ہے اور اس پر زیادہ تکلیف دہ وہ حق جو زید ابن علی کے متعلق دیا گیا ہے۔

صفحہ ۱۶۴ " آنحضرت کے مملوکات و مقبوضات خاص تھے جو مالک الملک حقیقی نے بلا مداخلت و کوشش مجاہدین کے آنحضرت کو عطا فرمائے تھے"۔

صفحہ ۲۳۷ " ہم 'سلطنت رسول خدا' کے لئے سب سے زیادہ حقدار تھے"۔

کسی بانی مذہب کا اپنے لئے مقبوضات و مملوکات رکھنا بے معنی ہے اور اس سے زیادہ نا قابل قبول وہ خیال ہے جو " سلطنت رسول خدا " کے متعلق ہے۔ ایک سیاسی فلسفی کے زاویہ نگاہ سے یہ دونوں دعوے بے معنی ہیں۔

مولف نے کئی جگہ بغیر دلیل کے علل قائم کئے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

صفحہ ۶۲۔ " لیکن حضرت عمر کے آخری دور سلطنت میں آثار زوال نمودار ہوگئے "۔

مبالغہ دیکھئے۔

صفحہ ۱۴۶۔ جنگ صفین " ان میں سے صرف آخری روز کی جنگ میں پانچ سو تیئس شامی امیرالمومنین کے ہاتھ سے قتل ہوئے "۔

صفحہ ۱۸۸ " زیاد جب تک امیرالمومنین علیہ السلام کی طرف سے حاکم ایران رہا نوشیرواں بنا رہا اور جب معاویہ سے سازش کرکے ان کے عہد میں حکمران ہوا تو چنگیز خاں سے بھی خونریزی میں بڑھ گیا "۔

ان کے علاوہ اور متعدد واقعات ہیں جو صرف اختصار کے خیال سے درج نہیں کئے جاتے۔

ایک مورخ کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ سلیس زبان لکھے۔ کیوں کہ غیر معروف ترکیبوں کے استعمال کرنے سے بہت سی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً

صفحہ ۱۹۸ " روز بازپرس کو دھیان رکھے ہوئے وہ کام کئے جو اس وقت کام آئیں "۔

ان تمام خامیوں کے باوجود مولف کی یہ محنت مستحق تعریف ہے اور اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ اسلام کا یہ الجھا ہوا زمانہ معرض بحث میں آئے گا۔ تاریخ میں اگر تحقیق سے کام نہ لیا جائے تو تاریخ کی حیثیت افسانے کی رہ جاتی ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ تحقیق کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

فاضل مولف میرے خیال میں پہلے اُردو تاریخ نویس ہیں جنہوں نے کھلم کھلا واقعات پر استدلال کیا ہے —

(۱)

سیرت عمرو ابن العاص

اس کتاب میں حضرت عمرو ابن العاص کے سوانح زندگی بیان کئے گئے ہیں ابتدا میں آنحضرت سے مخالفت۔ نجاشی کے پاس وفد لے کر جانا اور آخر میں خالد ابن ولید کے ساتھ مل کر مشرف بہ اسلام ہونا یہ سب واقعات وضاحت سے درج ہیں۔ مولف نے ان کے اوصاف بالخصوص شجاعت و تدبر کو بہت اہمیت دی ہے۔ شجاعت میں اُنہیں خالد ابن ولید کے ہم پلہ کیا ہے اور تدبر و فراست کے نقطۂ نگاہ سے انہیں خالد پر ترجیح دی ہے۔ ہم ان کی شجاعت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن کوئی حربیات کا ماہر ان کی فتوحات کو خالد کی ظفرمندیوں کے مقابلہ میں نہیں رکھ سکتا۔ خالد ابن ولید کی اکثر کامیابیاں عربوں کے خلاف ہیں۔ جن میں طرفین مساوی ہیں۔ جنگ احد میں قریش کی کامیابی۔ خلیفہ اول کے زمانے میں مرتد عربی قبائل کو مطیع بنانا۔ ایرانیوں کے خلاف سلاسل اور ولاجہ شام میں فتح یرموک سب خالد کی سپہ سالاری کا نتیجہ تھیں۔ عمرو ابن العاص کی فتوحات اُس وقت کی ہیں جب عربوں کے پاس آلات جنگ و دیگر ذرائع اور جنگی تجربہ پہلے سے کہیں بہتر تھا۔ اس کے ماسوا ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ معزولی کے بعد خالد ابن ولید کو کوئی موقع نہ ملا ورنہ فاتح مصر غالباً خالد ہی ہوتے۔ جنگ صفین میں تو عمرو ابن العاص کی جرنیلی کا بھرم کھل گیا۔ عمرو ابن العاص دوسرے درجے کے سپہ سالاروں میں ہیں اور ان کا مرتبہ سعد اور قعقاع کے برابر ہے —

مولف نے حزم و تدبیر میں ان کو حضرت عمر اور امیر معاویہ کے دوش بدوش رکھا ہے اس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ حضرت عمر کا مطمح نظر جداگانہ ہے یعنی مملکت اسلام کا استحکام اور حکومت میں عمومیہ کی حیثیت قائم رکھنا۔ عمرو ابن العاص اور امیر معاویہ کا مطمح نظر ذاتی اور جماعتی مفاد ہے۔ حضرت عمر کے ذرائع کہیں بھی ناجائز نہیں ہیں لیکن عمرو ابن العاص اور امیر معاویہ دونوں ذرائع اختیار کرنے میں اسلام کے دستور کے خلاف کام

کر جاتے ھیں- یہ اختلاف ان خطوط سے ظاھر ھو جاتا ھے جو حضرت عمر نے بحیثیت خلیفہ اور عمر و ابن العاص نے بہ حیثیت امیر مصر ایک دوسرے کو لکھے-

(صفحہ ۶۳-۶۴-۶۵) حضرت عمر نے یہ تحریر کیا "کہ سمجھہ لو کہ میں کوئی نا قابل سماعت عذر قبول نہ کروں گا- اگر تم نے ٹھیک کام کیا ھے تو برأت حاصل کرنے میں کیا قباحت ھے" عمر و ابن العاص نے جواب میں یہ لکھا "آپ نے اس مکتوب میں ذرا بھی میرا پاس اور آبرو کا لحاظ نہ رکھا- یثرب کا کوئی یہودی بھی ھوتا تو اس سے زیادہ آپ اُسے کیا لکھتے"-

تصفیہ دومۃ الجندل میں مولف نے مسعودی کا ساتھہ دیا ھے آپ فرماتے ھیں کہ کوئی زبانی فیصلہ نہ سنایا گیا مگر اس تحریر میں جو مولف نے کتاب میں درج کی ھے فیصلے کی کوئی صورت نہیں پائی جاتی- تحریر میں عمر و ابن العاص کے متعلق آخیر میں یہ لکھا گیا ھے کہ وہ دونوں کے عزل پر راضی ھو گئے لیکن عبداللہ کی خلافت پر راضی نہ ھوئے- اس وجہ سے بلا اس فیصلے کے کہ کون خلیفہ ھو صحیفہ ختم کر دیا گیا- اگر اس تحریری فیصلے پر اکتفا کیا جاتا تو عمر و ابن العاص اس فیصلے کو لے کر امیر معاویہ کے پاس کیونکر جاتے اور امیر اِن کو چھہ ھزار سپاہ دے کر مصر کی امارت کیوں تفویض کرتے اور اس فیصلے کے بعد امیر معاویہ امیرالمومنین کا لقب کیوں اختیار کرتے-

مولف نے عمر و ابن العاص کی خانگی زندگی پر نہایت سرسری نظر ڈالی ھے حالانکہ یہ زندگی سیرت کا ایک بہت بڑا جزو ھے بالخصوص قرون اولی میں خانگی زندگی سیاسی زندگی کے ساتھہ ساتھہ ھے- مولف نے عمر و ابن العاص کے خطوط درج کئے ھیں مگر ان سے کوئی نتیجہ نہیں نکالا- البتہ اس خط کے متعلق گبن و بٹلر کی راے ظاھر کی ھے جو مصر کی شادابی کے متعلق لکھا گیا ھے فاضل مولف نے خود صرف ترجمہ کر دیا ھے اور بلاغت کے متعلق اتنا بھی تو نہیں لکھا جتنا گبن یا بٹلر نے لکھا ھے-

مجموعی حیثیت سے مولف کی یہ ترتیب قابل تعریف ھے- زبان شستہ اور تاریخی مضمون کے مناسب ھے- بڑی خوبی یہ ھے کہ تاریخی اُلجھنوں سے بالکل پاک ھے- اس زمانہ میں ایسی کتابوں کی بہت ضرورت ھے-

(ا)

کشمیر کی رانیاں

یہ کشمیر کی بیس رانیوں کا چھوٹا سا تذکرہ ہے جو مولوی محمدالدین صاحب فوق کے اصرار و فرمایش دوستانہ پر محمد اسمعیل صاحب ہاتف بھوپالی نے کشمیر کی تاریخوں سے انتخاب کر کے تالیف کیا اور ظفر برادرس لاہور نے شایع کیا ہے۔کشمیر کی طویل تاریخ میں جس کی مدت تقریباً پانچ ہزار سال ہے صرف بیس رانیوں کے حالات زندگی ضمناً ملتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف صاحب کو کتنی ورق گردانی کرنی پڑی ہو گی کہ یہ چالیس صفحہ کا تذکرہ احاطۂ تحریر میں آیا۔جناب ہاتف نے اس کی ترتیب میں بڑے سلیقہ سے کام لے کر حشو و زوائد اور خلاف عقل واقعات کو قلم انداز کر دیا ہے اور تاریخی نقطۂ نظر کو پیش رکھہ کر یہ رسالہ تیار کیا ہے اس لحاظ سے جناب مولف کی محنت لائق داد ہے —

کتاب چھوٹے ۲۰×۳۰/۱۶ سائز پر چھپی ہے لکھائی چھپائی معمولی۔ قیمت چار آنہ۔ملنے کا پتہ:۔ ظفر برادرس تاجران کتب ظفر منزل لاہور —

(م)

سیرت علامہ عبدالحکیم سیالکوتی

ہندوستان کے علماء اور عربی داں طبقہ میں شاید کوئی ایسا نہ ہو گا جو علامہ عبدالحکیم سیالکوتی کے نام اور ان کی گرانمایہ تصانیف سے آشنا نہ ہو۔ منطق فلسفہ۔نحو۔تسفیر۔عقائد وغیرہ کی معرکہ آرا کتب پر مولانا کے شروح و حواشی اور بعض مستقل تالیفات نہایت بے بہا ہیں۔درس نظامیہ کے طلبا کو اب تک ان سے کچھہ نہ کچھہ کام پڑتا رہتا ہے۔مولانا علوم قدیمہ عربیہ میں مسلم اور فاضل سیالکوتی۔فاضل لاہوری کے نام سے مشہور تھے۔عہد اکبری سے لے کر دور شاہجہانی تک کے مشاہیر علماء و فضلاء میں شمار رہا۔ان کی فلسفی نکتہ آفرینیاں اور مذہبی مباحث وسط ایشیا و ایران تک کے حکماء کو محو حیرت کیا کرتی تھیں۔اُن کے دم سے سیالکوت میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری اور علم و فضل کا دریا رواں تھا اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃاللہ علیہ اور شاہجہاں کا نامور وزیر با تدبیر سعداللہ خاں ان کے ہم سبق رہے ہیں

باوجود ان تمام صفات و شہرت غیر فانی کے مولانا کے حالات و سوانح هنوز پردۂ خفا میں تھے۔مولوی محمدالدین صاحب فوق نے جذبۂ وطنی سے کام لے کر اس زبردست عالم کی سوانح عمری تیار کی۔جس میں تفصیل سے حالات و واقعات بهم پہنچانے کی کوشش کی اور مولانا محمود علی خاں ایم اے پروفیسر رندهیر کالج کپورتھله نے مولانا کی بعض مشہور تصانیف پر حق تنقید و تبصره ادا کیا ھے۔شروع میں حضرت اقبال نے جو مولانا کے نامور هم وطن هیں مختصر دیباچه زیب قلم کیا ھے۔آخر میں مشاهیر سیالکوٹ کے تذکرے اور سیالکوٹ کی مختصر تاریخ ھے جس سے معلوم هوتا ھے که شاهان مغلیه کے زمانه میں یه شہر علم و فضل اور صنعت و حرفت کا مشہور گہواره تھا۔یه کتاب مجموعی حیثیت سے دل چسپ اور تاریخی حالات و واقعات کی حامل ھے اور سوا سو صفحوں پر ختم هوتی ھے۔البته بعض واقعات مکرر سه کرر آگئے هیں اور زبان میں کہیں کہیں "پنجابیت" نمایاں ھے نام بھی نہایت طولانی اور بے ڈھنگا ھے۔یعنی (سوانحات عمر ملک العلماء علامۂ عبدالحکیم سیالکوٹی) اُمید ھے که مولف صاحب آئنده طباعت میں ان دونوں عیوب کو نکال دیں گے —

لکھائی چھپائی صاف اور کاغذ معمولی ھے سائز ۱۸ × ۲۲/۸ قیمت دس آنه ظفر برادرس تاجران کتب لاهور سے ملتی ھے —

(م)

اخلاق و تعلیم

درس حیات

یه کتاب محمد اکبر صاحب مراد پوری (هیڈ ماسٹر اسلامیه هائی اسکول دسوهه ضلع لایل پور) کی تالیف ھے کتاب مختلف اخلاقی مضامین کا مجموعه ھے اور بقول جناب مولف کے اس کا منشاء یه ھے که اخلاقی مضامین اور "مشاهیر کی سوانح عمریوں سے نوجوانوں کے جذبات و حسیات ابھارنے کی کوشش" کی جاے۔اس مقصد کو مدنظر رکھه کر ۱۸ مضامین "کیرکٹر" "مصائب کے فوائد" "مشکلات کا مقابله" "فراست" "خود ضبطی" وغیره پر لکھے گئے هیں۔انگریزی اخلاقی کتب سے حسب ضرورت مدد لی گئی ھے اور ان کے اقتباسات درج کئے گئے هیں —

دیباچہ میں فاضل مولف موجودہ کتب اخلاقیات کی شکایت کرتے ہیں کہ ''وہ صرف نظریات پراکتفا کرتے ہیں'' ہمیں افسوس ہے کہ باوجود مثالوں کی فراوانی کے یہ کتاب بھی نظری (Theoretical) ہی ہے۔اور کچھہ اسی پر موقوف نہیں ہے۔اخلاقیات کی ہرکتاب جوبالواسطہ اخلاقی نصائح کے عوض ''یہ کرو'' اور ''یہ نہ کرو'' کا دفتر ہوگی ضرور نظری ہوگی۔اخلاقی تعلیم کے فواید سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔لیکن اس تعلیم کا جوطریقہ پرانے زمانہ میں رائج تھا وہ ضرور قابل اعتراض ہے۔تجریدی مباحث اُس وقت تک نوجوانوں کی توجہ حاصل نہیں کرسکتے جب تک کہ وہ اخلاقی قصص اور افسانوں کی شکل اختیار نہ کریں —

کتاب انگریزی اخلاقی تصانیف۔Archetiets of fate, Uses of Life وغیرہ سے ماخوذہے۔اردو کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔زبان پرکسی قدر پنجابی اثر غالب ہے۔پھربھی سادہ اور صاف ہے۔اسلوب تحریر ناصحانہ ہے۔اچھی اچھی باتیں لکھی گئی ہیں اور جونوجوان اسے سمجھہ کر پڑہ سکے اس کے لئے ضرور مفید ثابت ہوگی —

تقطیع چھوٹی۔خط جلی اور واضح۔اچھی چھپی ہے اور جناب مولف سے دو ربیہ میں مل سکتی ہے —

(و)

———:o:———

تربیت۔حصۂ اول و دوم

مالیگاوں ضلع ناسک میں ایک چھوٹاسا مقام ہے ریلوے استیشن بھی نہیں، لیکن اس دورافتادہ مقام میں اردو زبان کا جوچرچا ہے وہ بہت غنیمت ہے۔ کثرت سے غزل گو شاعر موجود ہیں جن میں سے کئی ایک صاحب تلامذہ بھی ہیں مشاعرے بھی ہوتے ہیں گلدستے بھی نکلتے ہیں۔اس کی بعض ادبی انجمنیں بھی ہیں۔ان میں ایک دائرہ ادبیہ بھی ہے۔جس کے ناظم مولوی عبدالحمید صاحب نعمانی صاحبِ ذوق شخص معلوم ہوتے ہیں۔انہوں نے حال میں اس دایرہ سے تربیت حصہ اول اور تربیت حصہ دوم دو مختصر رسالے شایع کئے ہیں پہلا حصہ مصرکی نامور اور مشہورۂ آفاق ادیبہ آنسہ زینب مَی کے ایک مختصر رسالہ کا ترجمہ ہے۔جو موصوفہ نے مصرکے سرکاری مدارس میں لڑکیوں کی ابتدائی

تعلیم کیلئے تصنیف کیا تھا۔ اُس میں آنسہ می نے مصری معاشرت کو مدنظر رکھتے ہوے بچوں کو بہت ھی آسان طریقے سے مذھبی و اخلاقی تعلیم دی ھے۔ لیکن چونکہ مصری اور ھندستانی معاشرت متحد نہیں ھے اس لئے مترجم صاحب نے ترجمہ میں اپنی ملک کی ضروریات و داعیات کے لحاظ سے جابجا کمی بیشی بھی کی ھے اب یہ رسالہ اس قابل ھوگیا ھے کہ ھندوستانی بچوں کو پڑھایا جائے دوسرا حصہ اگرچہ ترجمہ نہیں بلکہ خود مولوی عبدالحمید صاحب کی تالیف ھے۔ مگر اُسے بھی پہلے حصے کی طرز پر لکھا ھے۔

چھوٹی تقطیع پر پہلا رسالہ ۳۱ اور دوسرا ۳۶ صفحہ پر ھے قیمت دو دو آنے۔

(م)

ساربان۔ امانت۔ نور ھدایت

یہ تینوں قصے بہت دلچسپ اور سبق آموز ھیں۔ پہلا قصہ جس کا نام ساربان ھے حضرت عمر کے عہد کا ھے۔ یہ ایک شخص کی سچائی کا حیرت انگیز امتحان ھے۔ دوسرا قصہ جس کا عنوان امانت ھے خلیفہ ھارون الرشید کے زمانہ کا ھے۔ اس میں ایک سوداگر نے امانت میں خیانت کی ھے اور خلیفہ کے دربار میں عجیب طرح سے اس کا فیصلہ ھوتا ھے۔ نور ھدایت میں ایک صحابی کی شہادت کا موقعہ مذکور ھے۔ یہ تینوں اخلاقی قصے ھیں اور اچھی اور صاف ستھری عبارت میں لکھے گئے ھیں۔ لڑکوں لڑکیوں کے پڑھنے کے قابل ھیں۔ چکنے کاغذ پر بہت اچھے چھپے ھیں۔ جہاں گیر کلب۔ چابک سواران لاھور سے مل سکتے ھیں۔ پہلے کی قیمت چار آنے دوسرے کی اڑھائی آنے اور تیسرے کی تین آنے ھے۔

مذھب

ذکریٰ

یہ ۴۸ صفحوں کا رسالہ مولانا ابوالکلام آزاد کے دو مضمونوں۔ تذکار مقدس (ماہ ربیع الاول) اور افسانہ ھجر و وصال کا مجموعہ ھے۔ جسے شرکت

ادبیہ علی گڈھ نے نہایت اہتمام سے اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر نفیس اور حسین و جمیل کتابت و طباعت کے ساتھہ خوبصورت سائز میں مجلد شایع کیا ھے اور اور یہ شرکت کے سلسلۂ معارف اسلام کا دوسرا نمبر ھے --

مولانا کا خطیبانہ پر زور طرز بیان اور خاص دل آویز انداز تحریر کسی معرفی کے محتاج نہیں ھیں اور جس قدر بیان و زبان اور قلم و تحریر میں زور و طنطنہ ھے اُسی قدر اھم مسائل دینی میں ژرف نگاھی بھی حاصل ھے - یہ دونوں خوبیاں مل کر مضامین و رسائل میں جو آپ کے قلم سے نکلتے ھیں ایک خاص بات پیدا کر دیتی ھیں جو مولانا ھی کے ساتھہ مخصوص ھے - چنانچہ یہ مجموعہ بھی ان محاسن کا حامل ھے --

پہلے مضمون میں ولادت با سعادت کی ضرورت و مقصد کو بیان کیا ھے - قرآن شریف کی آیات کو جا بجا اپنے مضامین میں جس طرح مولانا سمو لیتے ھیں وہ آپ ھی کا حصہ ھو گیا ھے - دنیا کی فلاح و اصلاح کے لئے خداے پاک کا طریقۂ جاریہ (سنۃ اللہ) روحانی تربیت - تکمیل ھدایت - عالم گیر پیام ظہور و مقصد ظہور - یادگار حریت وغیرہ عنوانوں کے ذیل میں بعثت و ضرورت بعثت نبوی کو دل نشین و پر اثر پیرایہ میں ثابت و واضح کیا ھے اور دیگر اولوالعزم رسل سے موازنہ و مقابلہ بھی ھو گیا ھے --

دوسرا مضمون افسانۂ ھجر و وصال ھے جس میں ھماری انتہائی غفلت و سرشاری - اسباب ھلاکت - حوادث حاضرہ - راہ نجات - خدا سے سرکشی کا نتیجہ وغیرہ عنوانات کے ذیل میں ملت اسلامیہ کے عروج و زوال - تباھی و بربادی کا نقشہ کھینچ کر ھوشیاری و بیداری تعلیم نہایت موثر پیرایہ میں دی ھے - قیمت کہیں درج نہیں - شرکت ادبیہ علی گڈھ کے علاوہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے بھی یہ رسالہ ملتا ھے --

(م)

———:o:———

بشریٰ

یہ ۴۸ صفحوں کا چھوٹا سا رسالہ مولانا سید سلیمان ندوی کی قیمتی تالیف اور زور قلم کا نتیجہ ھے جس میں اسلام کے بعض حقائق اور خصوصیات نیز اُن صفات باری تعالیٰ پر روشنی ڈالی ھے جو اسلام نے اپنے پیرووں کے

آگے گناے اور پیش کئے ھیں- یہ در اصل عیسائیوں کے ایک مشہور اعتراض کا زبردست و مدلل جواب ھے کہ —

اسلام نے خدا کا جو تخیل اپنے پیرووں کے سامنے پیش کیا ھے وہ یہ ھے کہ وہ (خدا) ایک جبار- قہار- پر غضب- صاحب جلال و جبروت شاھنشاہ ھے- جس سے بندوں کو ڈرتے کانپتے رھنا چاھئیے- مولانا نے نہایت عمدگی سے اس کا رد کیا ھے اور قرآن حکیم و احادیث صحیحہ سے ثبوت دیا ھے کہ اسلام اُمید و بیم خوف و رجا کے بین بین ھے —

شرکت ادبیہ علی گڈہ نے بسلسلۂ معارف اسلام شایع کیا ھے- لکھائی چھپائی نہایت نفیس و پاکیزہ اور کاغذ عمدہ ھے- قیمت چھہ آنہ ملنے کا پتہ شرکت ادبیہ علی گڈہ یا انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن —

(م)

متفرق

خیابان عرفان

اس کتاب کو دیکھتے ھی آنکھیں روشن ھوجاتی ھیں- اور مطالعہ کے بعد اس سے زیادہ دل و دماغ میں روشنی پیدا ھوتی ھے- یہ مستند فارسی شعرا کی رباعیات کا انتخاب ھے- جس میں کم و بیش اساتذہ کی پندرہ سو رباعیاں ھیں- انتخاب مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی صدر محاسب سرکار عالی کا ھے- جن کا ذوق ظاھری اور باطنی دونوں قابل داد ھیں- ذوق ظاھری کتاب کی نفیس جلد- عمدہ لکھائی چھپائی اور کاغذ سے ظاھر ھے- اور ذوق باطنی اس انتخاب سے جو انھوں نے بڑی کاوش اور کوشش سے کیا ھے- سید صاحب موصوف متعدد کتابوں کے مترجم اور مولف ھیں اور اپنی ھر کتاب میں انھوں نے نفاست مذاق کا ثبوت دیا ھے- یہ رباعیاں خاص خاص عنوانوں کے تحت میں جمع کی گئی ھیں- جو معرفت و اخلاق پر مشتمل ھیں- ھر صفحہ پر خوشنما بیل ھے- لوح بہت خوبصورت ھے- جلد پر ایک خوشنما منظر کی تصویر ھے- اور کتاب کے اندر ایسے ایسے جواھرات بکھرے ھوے ھیں جس کی داد صرف اھل بصیرت

دے سکتے ہیں۔اصحاب ذوق کے لئے یہ بے بہا تحفہ ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس کی پوری پوری قدر کی جائے گی۔

ہماری رائے میں یہ مناسب ہوتا کہ اگر شعرا کے نام کے ساتھہ اُن کا مختصر سا حال چند سطروں میں اور سنہ وفات وغیرہ بھی دے دیا جاتا۔سہواً چند قطعات بھی درج ہوگئے ہیں۔امید ہے کہ دوسرے اڈیشن میں نہ صرف اصلاح ہوگی بلکہ اور اضافہ بھی ہوگا۔یہ بھی کم خوشی کی بات نہیں ہے کہ کتاب نواب عماد الملک بہادر جیسے صاحب فضل و ذوق کے نام معنون کی گئی ہے۔

تعداد صفحات پانسو سے اوپر ہے قیمت چھہ روپیہ کلدار ہے اور فاضل مرتب سے مل سکتی ہے۔

———:o:———

مصرف جنگلات و تربیت جنگلات

یہ دو کتابیں مولوی ابو یوسف احمد محی الدین حسین صاحب فاروقی مددگار ناظم جنگلات ریاست حیدرآباد نے انگریزی سے ترجمہ کی ہیں۔اُردو زبان میں اس فن کی غالباً یہ پہلی کتابیں ہیں جو شایع ہوئی ہیں۔قابل مترجم نے اس کام کو بڑی محنت اور صرف کثیر کے بعد انجام دیا ہے۔کیوں کہ دونوں کتابیں بہت ضخیم ہیں۔اس قسم کے فنون کا ترجمہ آسان کام نہیں۔ ان میں سینکڑوں اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں جن کے مرادف الفاظ کا تلاش کرنا بہت دقت طلب ہے۔ترجمہ سلیس زبان میں کیا گیا ہے اور اصطلاحات میں بھی اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سہل الفاظ استعمال کئے جائیں۔مگر بعض بعض مقامات پر ترجمہ بالکل لفظی ہوگیا ہے جس کے سمجھنے میں ذرا دقت ہوتی ہے یا بعض جگہ ایسے لفظ استعمال کئے گئے ہیں جو کسی قدر ثقیل ہیں اور اُن کی جگہہ آسان الفاظ آسکتے تھے۔لیکن یہ خامیاں ایسی نہیں کہ اس سے مترجم کی محنت یا کتاب کی خوبی پر حرف آسکے۔یہ کتابیں خاص طور پر ملازمیں سررشتۂ جنگلات سرکار عالی کے فائدے کے لئے لکھی گئی ہیں اس لئے اس میں ایسے الفاظ بھی نظر آئیں گے جو حیدرآباد میں رائج ہیں اور دوسرے صوبوں میں جہاں اُردو بولی جاتی ہے آسانی سے سمجھہ میں نہ آئیں گے۔مثلاً نات۔مندا وغیرہ۔

دونوں کتابوں کے آخر میں درختوں کے مقامی اور انگریزی اور

لاطینی نام اور اُن کے مقابل ہندوستان کی مختلف زبانوں کے نام درج ہیں —

قابل مترجم کی محنت اور شوق قابل تعریف ہے اور ہمیں امید ہے کہ جن صاحبوں کے لئے یہ کتابیں ترجمہ کی گئی ہیں وہ اس کی قدر کریں گے اور خاطر خواہ مستفید ہوں گے —

———— :o: ————

سالانہ رپوٹ - دارالمعلومات موڈی کامٹی -

یہ دارالمعلومات جو انجمن ترقی اُردو (اورنگ آباد) کی شاخ ہے بہت مفید کام کررہا ہے - اس کے متعلق ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں اُردو زبان کی عمدہ اور منتخب کتابیں جمع کی گئی ہیں - لوگوں میں مطالعہ کا ذوق اور خیالات میں روشنی پیدا کرنے کا سب سے بہتر ذریعہ کتاب خانوں کا قیام ہے - اس رپوٹ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قابل ناظم محمد طالب الدین صاحب اور ان کے احباب دارالمعلومات کی ترقی دینے میں ہر قسم کی کوشش کر رہے ہیں - کتاب خانے کے ساتھ اخبارات و رسائل کا بھی انتظام کیا گیا ہے - ایسی مجلسوں کے انعقاد کا بھی انتظام کیا جاتا ہے جن میں مفید مباحث پر تقریریں ہوتی ہیں - ایک رسالہ جاری کرنے کی بھی تجویز ہو رہی ہے اور سب سے بڑی تجویز یہ ہے کہ دارالمعلومات کے لئے مستقل عمارت تعمیر کی جاے - حسابات کی باقاعدہ تنقیح ہوتی ہے - ہماری دلی تمنا ہے کہ یہ ترقی کرے اور اپنے فیض سے اہل کامٹی کو مستفید کرے —

———— :o: ————

روئداد جلسۂ سالانہ منبع الطب لکھنؤ

منبع الطب کا یہ جلسہ آنریبل راجہ راجیشر بلی صاحب بی - اے - او - بی - ایم ایل - سی وزیر صیغہ تعلیم کی صدارت میں ہوا - اس روئداد کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم محمد ہادی رضا خاں صاحب ماہر لکھنوی کی سعی اور مستعدی سے یہ مدرسہ ترقی کر رہا ہے اور طلبہ حکیم صاحب کی تعلیم سے مستفید ہو کر کامیاب ہو رہے ہیں - مدرسہ کی روح رواں خود حکیم صاحب ہیں اور حکیم صاحب کے علم و فضل اور سعی و کوشش سے جو رونق اس مدرسہ

کو حاصل ھے وہ لکھنؤ میں اس وقت کسی مدرسہ کو نہیں - اُمید ھے کہ جو صاحب طب یونانی کے قدرداں ھیں اس کی ضرور مدد کریں گے —

——:o:——

اُردو کے جدید رسالے

شمع

یہ رسالہ اسی سال جنوری سے نکلنا شروع ھوا ھے اور جنوری اور فروری کے دو پرچے شایع ھو چکے ھیں - اس کے اڈیٹر جناب محمد حبیب (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا - ایم - آر - اے - ایس پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڈہ اور جناب حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا آگرہ ھیں - دونوں صاحب فضیلت - صاحب ذوق اور پر جوش نوجوان ھیں - یہ قران السعدین شاید ھی اُردو کے کسی دوسرے رسالے کو نصیب ھو - قابل اڈیٹروں کی طرح رسالہ بھی ھونہار معلوم ھوتا ھے اور مضامین کی ترتیب اور نوعیت بتا رھی ھے کہ آگے چل کر نام پیدا کرے گا اور اُردو زبان کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہیں رھے گا - اس سے ایک گونہ خوشی ھوئی کہ اس رسالہ میں سیاسی مضامین کا بھی خیال رکھا گیا ھے - قطع نظر اُن سیاسی مسائل کے جو آے دن کانفرنسوں - کانگرسوں اور کونسلوں میں معرض بحث میں آتے رھتے ھیں اُردو داں طبقہ کو زیادہ تر علمی حیثیت سے سیاسیات کے جاننے کی ضرورت ھے - جہاں تک ھمارا خیال ھے سوا ے "زمانہ" کے اُردو کے دوسرے رسالوں میں بہت کم اس قسم کے مضامین شایع ھوتے ھیں - پروفیسر حبیب جن کے انگریزی مقالہ کا اُردو ترجمہ مبادی سیاسیات کے عنوان سے شمع کے فروری نمبر میں شایع ھوا ھے اس کام کے خاص طور پر اھل معلوم ھوتے ھیں اور ھمیں اُمید ھے کہ وہ اس سلسلہ کو جاری رکھیں گے - آج کل ھمارے ملک میں ھر کہ ومہ سیاست کے کوچے میں گام فرسا ھے مگر بہت کم لوگ ھیں جو اس کے تاریخی اور علمی پہلو سے واقف ھیں - رسالے اور اخبار زیادہ تر وقتی تحریریں ھوتی ھیں اور سب سے پہلے انھیں ملک کی وقتی ضروریات پر نظر رکھنی چاھئے - اگر یہ قابل نوجوان اڈیٹر اپنے رسالے کی یہ خصوصیت قرار دے لیں کہ اس میں ھر مہینے کم سے کم ایک دو مضمون سیاسیات پر اعلی پایہ کے شایع ھوا کریں گے تو وہ بہت بڑا کام کریں گے اور اُن کا یہ رسالہ

درحقیقت شمع هدایت کا کام دے گا۔ باقی غزل سرائی کے لئے بہت سے رسالے موجود ہیں اس لئے جعفری صاحب کو زیادہ پریشان خاطر ہونے کی ضرورت نہیں۔ رسالوں کو اپنی فرصت کا مشغلہ یا شوق پورا کرنے کا آلہ نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ اگر ضرورت ہو تو اپنے ذاتی شوق کو تج کر ملک کی ضرورت کو پورا کرنا چاہئے۔ یہ وقت ہائے وہو مچانے اور ہلڑ کے ساتھ ہو جانے کا نہیں ہے۔ یہ بہت نازک زمانہ ہے اس میں مزدوروں۔ محنتیوں اور جفا کشوں کی ضرورت ہے۔ ان الفاظ کے لکھنے کی ہمیں اس لئے جرأت ہوئی ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ان دونوں نوجوانوں میں اس کی صلاحیت اور قابلیت موجود ہے —

مطبع کی غفلت اور کافی نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے پہلا پرچہ اچھا نہیں چھپا تھا اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں۔ لیکن دوسرا پرچہ اس سے کسی قدر بہتر ہے لیکن اس پرچہ میں ہمیں "قلاع بازیاں" "نقاحت" "مبہوط" کے الفاظ دیکھ کر تعجب ہوا۔ ہم تو یہ توقع رکھتے تھے کہ ہمارے نوجوان دوست اُردو املا میں آسانیاں پیدا کریں گے نہ یہ کہ وہ اُسے اور دشوار بنا دیں گے۔ اُمید ہے کہ مضامین اور کاپیوں کے دیکھنے میں صحت کا زیادہ خیال رکھا جائے گا —

ہمیں اس زمانہ میں جب کہ رنگ برنگ کے رسالے جاری ہو رہے ہیں شمع کو دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ صحیح مقاصد ہی کے ساتھ نہیں مگر صحیح عمل کے ساتھ میدان میں آیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ ضرور کامیاب ہو گا —

میانہ تقطیع پر ۹۶ صفحہ کا حجم ہے قیمت سالانہ چھ روپیہ۔ کاغذ بہت اچھا لگایا گیا ہے۔ منیجر رسالہ شمع حسن منزل شاہ گنج آگرہ سے مل سکتا ہے —

———:O:———

عنادلیب

آج کل کوئی مہینا ایسا خالی جاتا ہو گا کہ نیا رسالہ نہ نکلتا ہو۔ لیکن جب کوئی اچھا رسالہ نظر آتا ہے تو جی خوش ہو جاتا ہے۔ یہ اردو کا علمی اور ادبی رسالہ خورجہ سے شایع ہوا ہے مگر دلی میں چھپا ہے۔ اڈیٹر ہلال احمد زبیری مارہروی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگرچہ بعض رسائل کے وجود سے اُردو زبان کو بہت کچھ فائدہ پہنچ رہا ہے " مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب مل کر بھی ملک میں صحیح ادبی روح پیدا نہیں کر سکتے " لہذا اس رسالے کے

جاری کرنے کی ضرورت ہوئی اور ہمیں توقع بلکہ یقین ہے کہ فاضل اڈیٹر ضرور "اس نوزائیدہ لہر کی رو بدل دینے میں" کامیاب ہوں گے - یہ پہلا نمبر ہے - دعوی بہت بڑا اور ارادہ بہت بلند ہے - خدا راس لائے اور کامیابی عطا فرمائے - لیکن جو کوشش انہوں نے اس نمبر کے مرتب کرنے میں کی ہے وہ ہر طرح قابل تعریف ہے - شروع میں ایک تصویر بھی ہے جس میں برکھارت کا سماں دکھایا ہے - مضامین بھی دلچسپ ہیں - نظموں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے - اور تقریباً سب نظمیں عمدہ اور پڑھنے کے لائق ہیں - پہلا مضمون "تحریک اتحاد نورانی" پر مولانا ظفر علیخاں صاحب کا ہے اور "مخزن الاثار" کے عنوان سے مولوی سعید احمد صاحب مارہروی کا مضمون اسلامی تعمیر کی تاریخ کے متعلق ہے - پروفیسر سید علی احسن صاحب احسن کا مضمون اصلاح اُردو بہت پر لطف ہے - ایک فسانہ بھی شروع کیا گیا ہے - رسالہ بحیثیت مجموعی بہت اچھا ہے اور ترقی کے آثار صاف نظر آتے ہیں - چھپائی لکھائی کا بھی خاص اہتمام کیا ہے - بڑی تقطیع کے ۶۰ صفحہ پر ہے - سالانہ قیمت چار روپیہ آٹھ آنہ —

———:o:———

کوکب

یہ رسالہ حال ہی میں اترولہ ضلع گونڈہ سے جاری ہوا ہے - ایسے مقام سے ایک اخلاقی اور ادبی رسالہ کا جاری ہونا بہت غنیمت ہے - مختلف قسم کے مضامین اور نظمیں درج ہیں - آخر میں کچھ معلومات اور خبریں بھی جمع کردی ہیں - قابل اڈیٹر غلام حیدر خاں صاحب کی محنت اور سعی قابل داد ہے کہ انہوں نے ایسے مقام سے ایسے رسالہ کی اشاعت کی ہمت کی ہے - اُمید ہے کہ اس علاقے کے اصحاب اس کی قدر کریں گے —

سالانہ قیمت مختلف طبقوں کے لوگوں سے مختلف ہے - عام پبلک اور طلبہ سے دو روپیہ آٹھ آنہ سالانہ ہے —

———:o:———

شادماں

یہ بھی بالکل تازہ رسالہ ہے - اسی سال سے شایع ہونا شروع ہوا ہے - ریاست جے پور سے نکلتا ہے - اڈیٹر حکیم نورالحسین صدیقی صاحب ہیں -

مختلف قسم کے مضامین درج ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر ادبی اور اخلاقی ہیں۔ دو ایک غزلیں بھی ہیں۔ ادبی تفریح اور دل چسپی کے لئے یہ اچھا رسالہ ہے۔ قابل اڈیٹر مستحق شکریہ ہیں کہ انہوں نے جے پور سے اردو کے ادبی رسالہ کے شایع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُمید ہے کہ اس سے ریاست جے پور میں اُردو ادب اور زبان کے صحیح ذوق پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔ صفحات پر علاوہ سلسلہ کے اعداد کے ہر مضمون کے اعداد الگ الگ لکھے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے لیکن اس سے کیا فائدہ جب کہ مضامین کی طبع میں اس امر کا خیال نہیں رکھا کہ ہر مضمون رسالہ سے الگ نکل سکے۔ ایک ہی صفحہ پر ایک مضمون ختم ہوتا اور دوسرا شروع ہوجاتا ہے۔

رسالہ جے پور کے نابالغ مہاراجہ مان سنگھہ کے نام سے منسوب ہے۔

خاصی بڑی تقطیع پر ۶۴ صفحے ہیں۔ کاغذ اچھا لگایا گیا ہے۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ ہے۔

———:o:———

اُردوے معلیٰ

مولانا حسرت موہانی نے فی الحال سیاسیات سے قطع تعلق کرکے پھر اُردوے معلیٰ شایع کیا ہے اور جنوری اور فروری کے نمبر ایک ساتھہ نکالے ہیں۔ اُردوے معلیٰ اُردو کا پرانا خادم ہے اور اس نے ادبی ذوق پیدا کرنے اور اُردو کی اشاعت میں قابل تعریف خدمت کی ہے۔ یہ رسالہ اول سنہ ۱۹۰۳ع سے سنہ ۱۹۱۳ع تک برابر جاری رہا لیکن حکومت کے حکم سے بند کردیا گیا تھا۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ اب وہ پھر جاری ہوا ہے اور اس کی ادبی دلاویزیاں وہی ہیں جو پہلے تھیں۔ بجاے سیاسیات کے اب بزرگان دین کے شجرے شروع میں درج کئے گئے ہیں۔ یہ نئی بات ہے جو پہلے اُردوے معلیٰ میں نہیں تھی۔ اس کے بعد مولانا نے اپنی ایک تصنیف نکات سخن کے نام سے شایع کرنی شروع کی ہے۔ اس کتاب میں متروکات سخن۔ معائب سخن۔ محاسن سخن۔ نوادرات سخن اور اصلاح سخن سے بحث ہوگی۔ چنانچہ اس وقت پہلی فصل جو متروکات سخن کے متعلق ہی شایع ہو رہی ہے۔ یہ مولانا کے مطالعہ اور ادبی ذوق اور تجربہ کا نچوڑ ہے۔ یہ تصنیف بڑے پایہ کی ہوگی اور ادیبوں۔ شاعروں۔ طالب علموں کے لئے بے حد کارآمد اور مفید ثابت ہوگی۔ اس لئے ہم

اُن صاحبوں کی خدمت میں جو اردو زبان اور ادب کا ذوق رکھتے ہیں دل سے یہ سفارش کرتے ہیں کہ وہ ضرور اسے مطالعہ کریں۔ یہ کتاب اُن کے حق میں بڑی نعمت ہوگی۔ مولانا نے ایک بڑا کام یہ بھی کیا تھا کہ اُن اساتذہ کے کلام کا جو اب تک طبع نہیں ہوا تھا یا جو ایک بار طبع ہوکر گمنام ہوگیا تھا انتخاب شایع کیا تھا۔ ابھی بہت سے اساتذہ باقی تھے۔ ان کا کلام بھی اُردوے معلیٰ میں مسلسل چھپنا شروع ہوگیا ہے۔ امید ہے کہ صاحبان ذوق اور اُردو زبان کے بہی خواہ اس رسالہ کی قدر کریں گے—

سالانہ چندہ صرف دو روپیہ چار آنے ہے۔ مولانا سے کانپور کے پتہ سے مل سکتا ہے—

———:o:———

ککے زئی

یہ قوم ککے زئی کا سہ ماہی رسالہ ہے۔ اس قوم کے لوگ زیادہ تر پنجاب میں آباد ہیں اور اس کے اکثر ارکان تجارت پیشہ ہیں۔ ان کی ایک مجلس ککے زئی سنٹرل ایسوسی ایشن کے نام سے لاہور میں قائم ہے۔ رسالہ کا مقصد قوم ککے زئی میں تعلیمی و معاشرتی اصلاح کرنے کا ہے۔ یہ بہت مبارک مقصد ہے بشرطیکہ یہ حضرات اپنے فرقے کی دھن میں ملک اور قوم کو نہ بھول جائیں۔ فرقہ واری کوششوں میں اکثر یہ عیب پیدا ہو جاتا ہے کہ لوگ بڑے مقصد کو بھول جاتے ہیں اور اُن میں ایک قسم کی تنگ دلی اور تنگ نظری پیدا ہوجاتی ہے ہمیں اُمید ہے کہ ککے زئی اپنے فرقے کی اصلاح کے جوش میں ملک کے فرائض کو فراموش نہیں کرے گا اور سلامت روی اور بیش بینی سے اپنے فرض کو انجام دے گا۔ جس طرح کوئی شخص تنہا دوسروں سے الگ رہ کر دنیا میں بسر نہیں کرسکتا اور نہ ترقی کرسکتا ہے اسی طرح کوئی فرقہ یا قوم ملک کی دوسری اقوام سے الگ رہ کر عروج حاصل نہیں کرسکتی۔ ککے زئی سے یہ توقع ہے کہ وہ اس خیال کو پیش نظر رکھے گا اور ایسی صورت میں وہ یقیناً اپنے فرقے کے لئے بہت زیادہ مفید ہوگا—

———:o:———

جام جہاں نما

یہ نیا رسالہ پانی پت سے مولوی محمد اسمعیل صاحب کی اڈیٹری میں ماہ مارچ سے شایع ہونا شروع ہوا ہے۔ رسالہ بڑے دعوے اور دم خم کے ساتھ

میدان ادب میں آیا ہے - وہ بعض موجودہ رسالوں پر فقرے کسنے کے بعد اردو کے چند نامور رسالوں کا نام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ "بھلا ہماری پہنچ اِن فلک نشینوں تک کہاں ہو سکتی ہے - پر لگاکر بھی اُڑیں تو وہاں تک نہیں پہنچ سکتے" لیکن اس انکسار اور عجز سے اُسے فوراً ندامت ہوتی ہے اور دوسرے ہی فقرے میں کہہ اٹھتا ہے "مگر نہیں ہمیں پہنچنا وہیں ہے - مانا کہ اس وقت نہیں پہنچ سکتے - دو چار چھہ برس میں سہی مگر ہمیں پہنچنا وہیں ہے - تکلیفیں اٹھاکر - دقتیں سہہ کر - بار بار ناکام رہ کر - مگر ہمیں پہنچنا وہیں ہے" آفرین ہے اس ہمت پر - اگر انہیں اپنے نفس پر ایسا ہی اعتماد ہے تو وہ ضرور وہاں تک پہنچ کر رہیں گے - اور ہماری آرزو ہے کہ جس مدت کا اندازہ انہوں نے کیا ہے اس سے بھی جلد پہنچیں - مولانا حالی مرحوم اور مولانا وحیدالدین صاحب سلیم کے ہم وطن کے لئے یہ کوی دشوار بات نہیں ہے - رسالہ دلچسپ ہے اور ہر قسم کے مفید معلومات جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے - یعنی ادبیات - اخلاقیات - اسلامیات - تذکرات - ایجادات - معلومات - اکتشافات - منظومات - فکاہات - تفریحات - عقلیات - نسائیات - صناعات - مجربات - استفسارات - تعارفات - تنقیدات یہانتک کہ "مفیدات" اور فسانے بھی ہیں - کیا ہے جو اس جام میں نہیں ہے - ۳۲ صفحے میں ساری کائنات آگئی ہے - گویا قابل اڈیٹر نے کوزہ میں سمندر بندکردیا ہے - مگر اس میں پیسہ اخبار کے انتخاب لاجواب کا رنگ نظر آتا ہے - سالانہ چندہ صرف ڈیڑہ روپیہ ہے - اس قیمت پر یہ رسالہ درحقیقت بہت ارزاں اور لایق قدر ہے - خدا اس کی عمر دراز کرے -
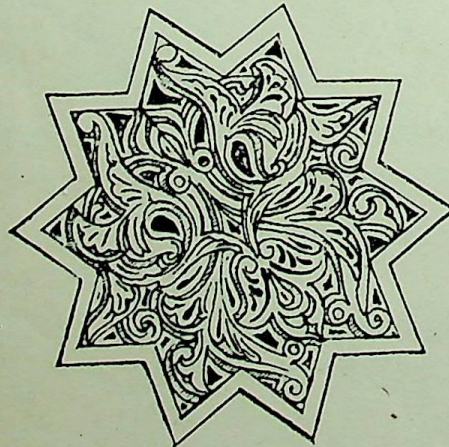
مطبوعات انجمن

جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق

سرکار نظام نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی کو جاپان کے تعلیمی نظام کے مطالعہ اور تحقیق کے لئے بھیجا تھا۔ نواب صاحب موصوف نے وہاں رہ کر اس عجیب و غریب ملک کے حالات اور خاصکر تعلیمی نظم و نسق کو نہایت غور اور تحقیق سے مطالعہ فرمایا۔ کتاب کے ابتدائی حصہ میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دلچسپ اور فاضلانہ بحث کی ہے۔ جو ہمارے اہل وطن کے لئے بہت سبق آموز ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو جاپان پر اس طرز میں لکھی گئی ہے۔ ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھے جو علاوہ دلچسپ ہونے کے پر از معلومات ہے۔ خاصکر ان لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے جو ملک کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں (حجم ۲۸۲ صفحہ)

قیمت فی جلد مجلد تین روپیہ کلدار

سرگزشت حیات یا آپ بیتی
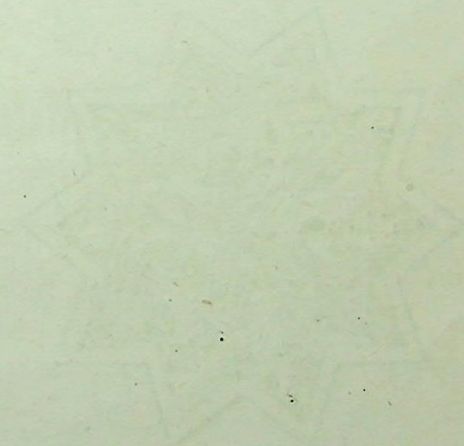
اس کتاب میں حیات کے آغاز اور اس کے نشو و نما کی داستان نہایت دلچسپ طرز پر بہت ہی سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے۔ حیات کی ابتدائی حالت سے لے کر اس کا ارتقا انسان تک پہنچایا گیا ہے اور تمام تاریخی مدارج کو اس سہل طریقہ سے بتایا گیا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا ہوا آدمی بھی سمجھ سکے اور اگرچہ جدید سے جدید علمی تحقیقات بھی اس میں آگئی ہے مگر بیان کی سلاست میں فرق نہیں آیا۔ یہ کتاب جدید معلومات سے لبریز ہے اور ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا لازم ہے (حجم ۳۰۰ صفحہ)

قیمت فی جلد مجلد دو روپیہ آٹھ آنہ کلدار۔

تذکرۂ شعرائے اردو

مولفۂ میر حسن دہلوی۔ میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں۔ ان کی مثنوی بدر منیر کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ہی اردو کی کسی کتاب کو نصیب ہوا ہو۔ یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف ہے۔ یہ کتاب بالکل نایاب تھی بڑی کوشش سے بہم پہونچا کر طبع کی گئی ہے۔ میر صاحب کا نام اس تذکرہ کی کافی شہادت ہے۔ اس پر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے جو قابل پڑھنے کے ہے۔ قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ ۱۴ آنہ کلدار۔ غیر مجلد ایک روپیہ ۶ آنہ کلدار۔

تاریخ تمدن

سر تامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا

ترجمہ ہے - الف سے ی تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے- حصۂ اول غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ مجلد دو روپیہ کلدار حصۂ دوم مجلد ۲ روپیہ کلدار —

مقدمات الطبیعات

یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان کے مشہور سائنس دار حکیم ہکسلے کی کتاب کا جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے- اس میں بظاہر فطرت کی بحث درج ہے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار- مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار —

القول الاظہر

امام ابن مسکویہ کی معرکۃ الارا تصنیف فوزالاصغر کا یہ اردو ترجمہ ہے -یہ کتاب فلسفۂ الہین کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انہیں اصول کو منطبق کیا گیا ہے قیمت غیر مجلد ۸ آنہ کلدار مجلد ایک روپیہ کلدار —

القمر

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ہوئے ہیں ان سب کو جمع کر دیا ہے طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے قیمت غیر مجلد ۱۰ آنہ کلدار- مجلد ا روپیہ کلدار —

قاعدہ و کلید قاعدہ

یہ قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے جن اصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہئے ان کی تشریح کے لئے ایک کلید بھی تیار کی گئی ہے- قاعدہ غیر مجلد ۲ آنہ کلدار- کلید قاعدہ غیر مجلد ۴ آنہ کلدار —

فلسفۂ تعلیم

ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلۂ تعلیم کی آخری کتاب ہے غور و فکر کا بہترین کارنامہ- والدین و معلم کے لئے چراغ ہدایت ہے- تربیت کے قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے- اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے- قیمت مجلد ۳ روپیہ کلدار- غیر مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

دریائے لطافت

ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاالله خاں کی تصنیف ہے- اردو صرف و نحو اور محاورات اور الفاظ کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں- قیمت غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ کلدار مجلد ۲ روپیہ کلدار —

طبقات الارض

اس فن کی پہلی کتاب ہے- تین سو صفحوں مین تقریباً جملہ مسائل

قلم بند کئے ہیں۔کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور ان کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے۔قیمت غیر مجلد ۲ روپیہ کلدار مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار—

مشاہیر یونان و رومہ

ترجمہ ہے۔سیرت نگاری اور انشاپردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے۔ ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے۔وطن پرستی اور بے نفسی عزم وجواں مردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے۔قیمت جلد اول غیر مجلد ۳ روپیہ کلدار۔مجلد ۴ روپیہ کلدار جلد دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار—

اسباق النحو

ملک کے ادیب کامل مولانا حمید الدین صاحب بی اے کی تالیف ہے اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے۔قیمت حصۂ اول غیر مجلد ۶ آنہ کلدار حصۂ دوم غیر مجلد ۴ آنہ کلدار—

علم المعیشت

اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم اے نے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے۔ مبہم و مشکل مسائل کو پانی کر دیا ہے اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں۔اشتراکیت کا باب قابل دید ہے۔ حجم ۸۸۵ صفحے قیمت مجلد ۵ روپیہ ۸ آنہ کلدار—

تاریخ اخلاق یورپ

اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم و تبحر۔تحقیق و صداقت کا مرادف ہے۔ یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن۔ معاشرت – اصول – اخلاق – مذاہب و خیالات کا مرقع ہے۔حصۂ اول مجلد ۳ روپیہ کلدار حصۂ دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار—

تاریخ یونان قدیم

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ۔اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے۔ایف اے کلاس کے طلبا جو یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے۔قیمت مجلد ۲ روپیہ کلدار—

انتخاب کلام میر

میر تقی میر تاج شعرائے اردو کے کلام کا انتخاب ہے۔مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے اور شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۴۰ صفحہ کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔قیمت مجلد ۲ روپیہ کلدار—

رسالۂ نباتات

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے - علمی اصطلاحات سے معرا - طلباء نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھہ سکیں وہ اس رسالہ میں مطالعہ کریں قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنہ کلدار —

دیباچۂ صحت

اس کتاب میں مطالبات صحت پر (مثلاً ھوا - پانی - غذا - لباس - مکان وغیرہ) مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ھے - زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دلپزیر ھے ملک کی بہترین تصنیف ھے - اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا - حجم ایک ہزار صفحے - قیمت مجلد چار روپیہ کلدار —

قواعد اردو

ارباب فن کا اتفاق ھے کہ اردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھے گئے - بسط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ھے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ھے قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار —

نکات الشعراء

یہ اردو کا تذکرہ استادالشعرا میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ھے - اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں - نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ھیں - مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدرالصدور امور مذھبی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ھے - قیمت مجلد دو روپیہ ۴ آنہ کلدار —

فلسفۂ جذبات

کتاب کا مصنف ھندوستان کا مشہور نفسي ھے - جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھہ بحث کی گئی ھے - متعلمان نفسیات اسے مفید پائیں گے قیمت مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار غیر مجلد دو روپیہ کلدار —

وضع اصطلاحات

یہ کتاب ملک کے نامور انشا پرداز اور عالم مولوی وحیدالدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعہ کے بعد تالیف کی ھے بقول فاضل مولف "یہ بالکل نیا موضوع ھے - میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ھے نہ ایشیا کی کسی زبان میں" - اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھہ بحث کی گئی ھے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ھیں - مخالف و موافق رایوں کی تنقید کی گئی ھے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے - سابقوں اور لاحقوں - اردو مصادر اور ان کے

مشتقات - غرض سیکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آگئی ہیں - اردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان میں ان کی نظیر نہیں - لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کردی ہیں اور ہمارے حوصلہ بلند کردئے ہیں - اس سے پہلے ہم اردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور اس کی آیندہ ترقی کے متعلق دعویٰ کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے - مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا - اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے - تعداد صفحات ۳۰۵ قیمت مجلد تین روپیہ ۱۲ آنہ کلدار —

نفح الطیب

یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کے معلومات کا خزانہ ہے - خلافت اسپین کے ہر مورخ کو اس کی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے - علامۂ مقری کی نامور اور مشہور آفاق کتاب ہے جو پہلی دفعہ اردو میں ترجمہ ہوئی ہے - یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہے صفحات ۶۰۴ قیمت مجلد چھہ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

محاسن کلام غالب

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا معرکۃ الارا مضمون ہے - اردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہے - یہ مضمون اردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا - صاحب نظر قدر دانوں کے اصرار سے الگ بھی طبع کیا گیا ہے - قیمت غیر مجلد ۸ آنہ کلدار —

ملل قدیمہ

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے - اس میں بعض قدیم اقوام - سلطنت کلدانی - آشوری - بابل - بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت - عقائد - صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھہ دئے ہیں - اردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہوسکیں اس لئے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے حالات کی وضاحت کے لئے جا بجا تصویریں دی گئی ہیں - صفحہ ۲۷۴ - قیمت مجلد دو روپیہ ۶ آنہ کلدار —

بجلی کے کرشمے

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے - برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی ہے - ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے - کہاں سے آتی ہے - کیا کام آسکتی ہے - یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے - لڑکے لڑکیوں کے لئے بھی مفید ہے - قیمت دو روپیہ ۴ آنہ کلدار —

——:o:——

حسب ذیل کتابیں بھی انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ھیں
(کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ھیں)

(دارالمصنفین اعظم گڈھ)

۱- سیرۃ النبی حصۂ اول ۴ روپیہ
۲- سیرۃ النبی حصۂ دوم ۳ روپیہ ۸ آنہ
۳- سیرۃ النبی حصۂ سوم ۶ روپیہ
۴- شعرالعجم مکمل ۵ حصے ۱۳ روپیہ
۵- سفرنامہ مولانا شبلی ۲ روپیہ
۶- علم الکلام ۲ روپیہ
۷- الکلام ۲ روپیہ
۸- کلیات شبلی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۹- اسوۂ صحابہ مکمل دو حصہ ۸ روپیہ
۱۰- انقلاب الامم ۲ روپیہ
۱۱- برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۲- مکالمات برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۳- مثنوی بحرالمحبت ۱۲ آنہ
۱۴- تفسیر ابومسلم اصفہانی (عربی) ۲ روپیہ
۱۵- سیرالصحابیات ۲ روپیہ ۴ آنہ
۱۶- روح الاجتماع ۲ روپیہ
۱۷- ابن رشد ۴ روپیہ
۱۸- گل رعنا ۵ روپیہ
۱۹- سیرالانصار ۳ روپیہ ۸ آنہ

(مطبع کاویانی - برلن)

۱- موش و گربہ (فارسی) ۵ آنہ ۶ پائی
۲- زادالمسافرین (فارسی) ۸ روپیہ
۳- گلستان (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۴- تیاتر (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۵- تاریخ سنی ملوک الارض (عربی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۶- نصاب الصبیاں (فارسی) ۱ روپیہ
۷- رہنماے پسراں (فارسی) ۱ روپیہ ۸ آنہ
۸- تلغراف بی سیم (فارسی) ۱ روپیہ
۹- ہزار و یک سخن (فارسی) ۱۱ آنہ

(جامعہ ملیہ - علی گڈھ)

۱- الخلافت الکبریٰ ۵ روپیہ
۲- الصراط المستقیم ۲ روپیہ
۳- بصائر ۶ آنہ
۴- سیرۃ الرسول ۱ روپیہ ۸ آنہ
۵- خلافت راشدہ ۲ روپیہ
۶- خلافت بنی امیہ ۱ روپیہ ۸ آنہ
۷- خلافت عباسیہ ۲ روپیہ
۸- خلافت عباسیہ بغداد ۲ روپیہ
۹- مبادی معاشیات ۱ روپیہ
۱۰- انتخاب میر (از نورالرحمن صاحب) ۱ روپیہ
۱۱- قواعد عربی ۲ روپیہ
۱۲- عرض جوھر ۸ آنہ
۱۳- مجموعہ کلام جوھر ۶ آنہ
۱۴- اسلامی تہذیب و قومی تعلیم ۴ آنہ
۱۵- ازھارالعرب ۸ آنہ

۱۶- انتخاب مضامین جوہر ۱ روپیہ
۱۷- ترکوں کی کہانیاں ۴ آنہ
۱۸- خطبہ شیخ الہند ۲ آنہ
۱۹- خطبہ حکیم اجمل خاں صاحب ۲ آنہ
۲۰- ہمارے نبی ۸ آنہ
۲۱- تاریخ ہند قدیم ۱ روپیہ
۲۲- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ۱۲ آنہ

(نظامی پریس- بدایون)

۱- قاموس المشاہیر جلد اول ۶ روپیہ
۲- نکات غالب مجلد ۱ روپیہ
۳- دیوان غالب مشرح مجلد دو روپیہ ۸ آنہ
۴- دیوان جان صاحب مجلد ۱ روپیہ ۸ آنہ
۵- دیوان درد ۱ روپیہ ۴ آنہ
۶- دیوان غالب (لائبریری ایڈیشن) ۱ روپیہ ۸ نہ
۷- خطوط سرسید قسم اول ۳ روپیہ
۸- خطوط سرسید قسم دوم ۲ روپیہ
۹- لیتھوگرافی مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ
۱۰- انتخاب زرین مجلد ۲ روپیہ
۱۱- مراثی انیس جلد اول مجلد ۱۰ روپیہ
۱۲- مراثی انیس جلد دوم قسم اول ۸ روپیہ قسم دوم ۴ روپیہ
۱۳- تذکرۃ الصلحا ۸ آنہ
۱۴- کنز التاریخ ۱ روپیہ ۸ آنہ

(دائرۂ ادبیہ- لکھنؤ)

۱- یادگار غالب ۳ روپیہ
۲- مکاتیب امیر مینائی ۲ روپیہ ۸ آنہ
۳- مکاتیب اکبر ۱ روپیہ
۴- مینائے سخن ۱ روپیہ
۵- حزن اختر ۸ آنہ
۶- درس عمل ۴ آنہ
۷- خواتین انگورہ ۱ روپیہ
۸- بیگمات بنگال ۶ آنہ
۹- اسلام کا اثر یورپ پر ۴ آنہ
۱۰- مشرقی ترکستان ۶ آنہ
۱۱- سیاحت زمین ۱ روپیہ
۱۲- سیاحت ہوا ۱ روپیہ

الناظر پریس- لکھنؤ

۱- تاریخ عرب ۷ روپیہ ۸ آنہ
۲- موازنہ انیس و دبیر ۳ روپیہ
۳- مقدمہ شعر و شاعری ۱ روپیہ ۴ آنہ
۴- اصول النسخ ۶ آنہ
۵- مسلمانان اندلس ۱ روپیہ ۸ آنہ
۶- اسرار رنگون ۱ روپیہ
۷- ہوم رول ۵ آنہ
۸- خوان دعوت ۱ روپیہ
۹- مصنوعی شوہر ۲ آنہ
۱۰- وکرم اروسی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۱- مسلمانوں کی تہذیب ۶ آنہ
۱۲- الاحسان ۸ آنہ
۱۳- ارض نہریں ۴ آنہ
۱۴- تذکرۂ حزیں ۴ آنہ
۱۵- حیات نظامی ۴ آنہ
۱۶- خطاب ۴ آنہ

۱۷- میلاد نبوی ۴ آنہ
۱۸- تصویر درد ۴ آنہ
۱۹- شمع و شاعر ۲ آنہ
۲۰- فریاد اُمت ۳ آنہ

(دوسری قابل قدر کتابیں)

۱- رسائل شبلی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۲- کتب خانہ اسکندریہ ۵ آنہ
۳- مسدس حالی ۱۲ آنہ
۴- جنگل کی پہلی کہانی ۵ آنہ
۵- بادل کے بچے ۱ روپیہ
۶- بانگ درا ۴ روپیہ
۷- یادگار غالب ۱ روپیہ ۸ آنہ
۸- مجموعہ نظم حالی ۸ آنہ
۹- اکبری اقبال ۳ آنہ
۱۰- الفاروق ۳ روپیہ
۱۱- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ۸ آنہ
۱۲- نظم شبلی ۴ آنہ
۱۳- نفس اللغۃ ۱ روپیہ
۱۴- ترانۂ شوق ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۵- خوبی سخن ۸ آنہ
۱۶- دیگر ممالک میں قطع تعلق ۱۰ آنہ
۱۷- آزادی اسلام ۴ آنہ
۱۸- مصطفیٰ کمال پاشا ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۹- گوکھلے کی تقریریں ۱۲ آنہ
۲۰- سلف گورنمنٹ ۶ آنہ
۲۱- عالم خیال ۸ آنہ
۲۲- حیات خسرو ۸ آنہ
۲۳- نظام حیات انسانی ۸ آنہ
۲۴- فرہنگ فارسی جدید ۱ روپیہ ۸ آنہ
۲۵- فرہنگ عربی جدید ۱ روپیہ ۸ آنہ
۲۶- اسلامی حکومت ۲ آنہ

———:o:———

دیوان غالب جدید و قدیم

یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بیحد انتظار تھا- اس میں میرزا غالب کا قدیم وجدید تمام کلام موجود ہے- میر صاحب کے قدیم کلام ملنے کی کسے توقع تھی یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہاتھ آگیا اور اب ریاست بھوپال کی سرپرستی میں چھپ کر شائع ہوا ہے- مع مقدمۂ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم مجلد ۵ روپیہ کلدار- غیر مجلد ۴ روپیہ کلدار (بلا مقدمہ مجلد ۳ روپیہ ۸ آنہ کلدار غیر مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار)—

مکاتیب

نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مرحومین کے غیر مطبوعہ خطوط کا قابل قدر- دلچسپ- پر از معلومات اور بہترین مجموعہ- مرتبۂ مولوی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ ریاست بھوپال ۱ روپیہ—

المشتہر

انجمن ترقی اُردو- اورنگ آباد (دکن)

یہ کتابیں بھی انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہیں

(کل قیمتیں سکۂ کلدار میں ہیں)

نیرنگ ارض
مولفہ مولوی سید راحت حسین
صاحب بی-اے ۱ روپیہ ۴ آنہ

سیرالمصنفین
مولفہ مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا
وکیل غازی آباد ۲ روپیہ

Hindustani Simplified (اُردو آموز)
ونیش چندردت صاحب بی اے ۳ روپیہ

شرح Hindustani Simplified
مولفہ ونیش چندردت صاحب بی اے
۱ روپیہ

رسالہ نماز Prayer Book
خان صاحب عابد علی خاں صاحب
۱ روپیہ

ابتدائی تعلیم کی رام کہانی
مولفہ منشی رام پرشاد صاحب بی اے
۱ روپیہ ۴ آنہ

ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور اُن کی جغرافیائی کیفیت
مولفہ منشی رام پرشاد صاحب بی اے
۶ آنہ

وہ جاندار جو نظر نہیں آتے
مولفہ منشی رام پرشاد صاحب بی اے
۴ آنہ

(دارالاشاعت پنجاب لاہور کی کتابیں)

کتاب	قیمت
اخترالنسا بیگم	۱ روپیہ ۸ آنہ
دکھہ بھری کہانی	۲ آنہ ۶ پائی
روشنک بیگم	۲ روپیہ
رانی کرونارت	۱ آنہ
رسوم دہلی	۴ آنہ ۶ پائی
ان پورنا دیوی کا مندر	۱ روپیہ ۸ آنہ
ایام غدر	۱ روپیہ ۴ آنہ
نقش فرنگ	۱ روپیہ ۴ آنہ
پریم پچیسی مکمل	۳ روپیہ
بانگ درا مجلد	۵ روپیہ ۸ آنہ
بانگ درا غیر مجلد	۴ روپیہ
نعمت خانہ	۱ روپیہ ۴ آنہ
خواب راحت	۴ آنہ
چندن ہار	۲ آنہ
انمول موتی	۱ آنہ ۶ پائی
سوکن کا جلاپا	۶ آنہ
گوہر مقصود	۶ آنہ
لیلیٰ	۲ آنہ
سواءالسبیل	۱ روپیہ
سخندان پارس	۱۰ آنہ
قوانین دولت	۴ آنہ
میدا	۱۲ آنہ
چترا	۱۲ آنہ